ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

HRCP

جلدنمبر33...شمارہ نمبر08...اگست2025

Registered No. CPL-13



ایچ آر سی پی شکایات سیل

ایچ آر سی پی شکایات سیل نے 1985ء میں کام شروع کیا جب کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ایسا مخصوص سیل موجود نہیں تھا جو مظلوم لوگوں کی شکایات وصول کرتا ہو۔ اس وقت سے، ایچ آر سی پی پاکستان بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔

ایچ آر سی پی شکایت سیل کو ماہانہ سینکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ہم جونہی خواتین کے خلاف تشدد، محکمہ جاتی مسائل، اقلیتوں کے حقوق، جبری شادیوں، جبری تبدیلی مذہب، جبری گمشدگیوں، سائبر جرائم اور دیگر تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق شکایات وصول کرتے ہیں اور اس پر ایکشن لیتے ہیں۔ تاہم، مالی معاونت، سیاسی پناہ، جائیداد کے تنازعات یا ذاتی تنازعات سے متعلق شکایات ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

طریقہ کار

جیسے ہی ہمیں شکایات موصول ہوتی ہیں ہم متعلقہ حکام سے رابطہ کرتے ہیں اور کیس پر کارروائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ہمارا بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ایک براہ راست ریفرل نظام موجود ہے جس کا مقصد شکایت کے فوری ازالے کو یقینی بنانا ہے۔

ہم سے رابطہ کریں

اگر آپ نے کوئی شکایت درج کرانی ہے تو ہمیں کال کر سکتے ہیں، واٹس ایپ کر سکتے ہیں، ای میل بھیج سکتے ہیں یا خط ارسال کر سکتے ہیں۔
آپ اپنے قریبی ایچ آر سی پی شکایات ڈیسک میں بذات خود جا کر شکایت رجسٹر کروا سکتے ہیں اور کمپلینٹ آفیسر سے بذات خود بات کر سکتے ہیں۔

لاہور	کراچی	پشاور
ایوان جمہور۔ 107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 فون : 3586 5969 ,3583 8341 ,4994 3586 42 92+ ای میل : hrcp@hrcp-web.org ویب سائیٹ : www.hrcp-web.org مرکز شکایات سیل فون : 5969 3584 042 92+ موبائل : 4884 341 0321 92+ ای میل : complaints@hrcp-web.org	یونٹ نمبر 08، فلور 1 سٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (الاکو ہاؤس) عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی۔ 74400 فون : 7132 3563 ,7131 3563 21 92+ شکایات سیل (موبائل) : 6287 111 315 92+ ای میل : karachi@hrcp-web.org	43 گلشن اقبال لین (نزد اراب روڈ سٹاپ) یونیورسٹی روڈ، پشاور فون : 4253 584 091 92+ شکایات سیل (موبائل) : 0640 950 0318 92+ ای میل : peshawar@hrcp-web.org

اسلام آباد	کوئٹہ	حیدر آباد
آفس 1-B، فلور 2 بلاک ڈی-12، (اوپر فیصل بینک) جی 8، مرکز، اسلام آباد فون : 1127 835 51 92+ شکایات سیل (موبائل) : 4773 569 333 92+ ای میل : islamabad@hrcp-web.org	فلیٹ نمبر C-6 کبیر بلڈنگ ایم۔اے جناح روڈ، کوئٹہ فون : 7869 282 81 92+ شکایات سیل (موبائل) 6125 294 306 92+ ای میل : quetta@hrcp-web.org	306- فائزہ آرکیڈ، (لوفٹ اینڈ میزانائن فلور) نزد مسجد حاجی شاہ بخاری درگاہ صدر کنٹونمنٹ، حیدر آباد فون : 770 720 ,3688 278 22 92+ فیکس : 4645 278 22 92+ شکایات سیل (موبائل) : 2222 339 310 92+ ای میل : hyderabad@hrcp-web.org

ملتان	گلگت	تربت/مکران
2511/5A ابدالی کالونی نزد بریٹین سکول ملتان فون : 7217 451 61 92+ شکایات سیل (موبائل) : 5529 665 331 92+ ای میل : multan@hrcp-web.org	آفس نمبر 8-9، رانگ یل پلازہ جماعت خانہ روڈ، ذوالفقار آباد کالونی، جتیال، گلگت موبائل : 5553 547 0344 92+ شکایات سیل (موبائل) : 1088 454 355 92+ ای میل : gilgit@hrcp-web.org	پرواز ہاؤس، بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پسنی روڈ، تربت، کیچ فون : 365 413 852 92+ شکایات سیل (موبائل) : 2406 234 323 92+ ای میل : turbat@hrcp-web.org

قومی گول میز کانفرنس کا میڈیا اور ڈیجیٹل آزادیوں کے تحفظ کا مطالبہ

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے یورپی یونین کی معاونت سے ایک قومی گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں ماہرینِ تعلیم، سول سوسائٹی کے رہنما، وکلا، مدیران اور میڈیا سے وابستہ افراد نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا مقصد اظہارِ رائے کی آزادی پر بڑھتی ہوئی پابندیوں اور ڈیجیٹل اسپیس کی کم ہوتی گنجائش کا جائزہ لینا تھا۔

گول میز کانفرنس کا آغاز معروف سیاسیات دان ڈاکٹر محمد وسیم کے ابتدائی کلمات سے ہوا، جبکہ نظامت کے فرائض ڈیجیٹل حقوق کی کارکن فریحہ عزیز نے انجام دیے۔ انہوں نے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ (پیکا) 2025 میں ترمیم، خصوصاً دفعہ 37، کی وضاحت کی، جو پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) کو مبہم اور وسیع اختیارات دیتی ہے۔ کئی مقررین نے آن لائن مواد تخلیق کرنے والوں کے خلاف حالیہ کارروائیوں میں قانونی طریق کار کی عدم پیروی کی نشان دہی کی۔ صحافی مطیع اللہ جان اور اسد طور نے بتایا کہ یوٹیوب چینلز کو پیشگی اطلاع یا کسی قانونی کارروائی کے بغیر بند کیا گیا۔

اینکر پرسن ابصا کومل نے سینسرشپ کے طریقوں میں تبدیلی کی نشاندہی کی، جو اب گرفتاریوں کے بجائے معاشی دباؤ اور ادارتی دھمکیوں کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں، جس کے باعث بہت سے افراد خود پر سنسرشپ نافذ کرنے پر مجبور ہیں۔ روزنامہ ڈان کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر عامر وسیم نے ان خیالات سے اتفاق کیا۔ اینکر پرسن اور ایچ آر سی پی کی شریک چیئر پرسن منیزے جہانگیر نے خبردار کیا کہ حکام سول سوسائٹی اور میڈیا کے درمیان اختلافات کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انہوں نے تمام متعلقہ فریقین کے درمیان اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔

ایڈووکیٹ طلحہ سرفراز خان نے ہتکِ عزت اور ہراسانی کے درمیان فرق واضح کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ بیرسٹر ردا حسین اور ایڈووکیٹ عثمان وڑائچ نے ہتکِ عزت کے قوانین کے غلط استعمال پر تنقید کی، جو شہریوں کے بجائے ریاستی اداروں کے تحفظ کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، اور کہا کہ ڈیجیٹل حقوق کی پامالی گویا ایک 'ڈیجیٹل مارشل لا' کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

خیبر پختونخوا اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے صحافیوں نے ان دونوں صوبوں سے رپورٹنگ میں درپیش مشکلات کی نشاندہی کی اور کہا کہ دوردراز علاقوں میں جاری جبر اب شہری مراکز تک بھی پھیل چکا ہے۔ شرکا اس بات پر متفق تھے کہ پیکا 2016 اور اس میں 2025 کی ترمیم کو یا تو مکمل طور پر منسوخ کیا جائے یا کم از کم اس میں ترمیم کی جائے۔

سابق سیکریٹری جنرل پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایچ آر سی پی کے کونسل رکن ناصر زیدی نے سول سوسائٹی سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر فوری قانونی اصلاحات کے لیے آواز بلند کرے۔ صحافی ماہم مہر نے کہا کہ صرف قوانین ہی کافی نہیں ہیں بلکہ معاشی اور قانونی راستوں کو بھی حکمتِ عملی کے ساتھ اپنانا ہوگا۔

سابق سینیٹر اور ایچ آر سی پی کے کونسل رکن فرحت اللہ بابر نے سینیٹ کی کمیٹی برائے اطلاعات سے مطالبہ کیا کہ وہ پیکا سے متعلق ایف آئی اے کے مقدمات کا ڈیٹا حاصل کرے اور اسے عام کرے۔ انہوں نے توہینِ مذہب کے قوانین اور پیکا کے غلط استعمال کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن کے قیام اور ڈیجیٹل نگرانی پر نظرِ ثانی کا بھی مطالبہ کیا۔

ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے گول میز کانفرنس کے اختتام پر کہا کہ اظہارِ رائے کی آزادی کے بغیر کوئی بھی حق — خواہ وہ شہری، معاشی ہو یا سماجی — پر بات کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ریاستی پالیسیوں پر تنقید اور سیاسی اختلافِ رائے پر پابندیوں کی بجائے نفرت انگیز تقریر، آن لائن ہراسانی اور تشدد پر قابو پانا ضروری ہے۔

[پریس ریلیز۔ اسلام آباد۔ 17 جولائی 2025]

فہرست

ایچ آر سی پی کا اپنی سرگرمیوں پر قدغن لگانے کی کوششوں پر اظہارِ تشویش

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ملک میں انسانی حقوق کے دفاع کے کام کے لیے مسلسل سکڑتی ہوئی فضا پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔

گزشتہ چند مہینوں میں، ایچ آر سی پی کو من مانے، غیر قانونی اور بلاجواز اقدامات کے ایک سلسلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس سے ادارے کو اپنی سرگرمیوں کی مؤثر انجام دہی میں مشکلات درپیش ہیں۔ ایچ آر سی پی کا کام تمام شہریوں اور افراد کے حقوق پر مبنی ہے، جن کی ضمانت پاکستان کے آئین اور ملک کے بین الاقوامی وعدوں اور ذمہ داریوں میں بھی دی گئی ہے۔

ہمیں یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی ہے کہ سیکورٹی اداروں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے افراد نے تقریبات کے مقام کی انتظامیہ یا ہمارے عملے کو یہ بتا کر ایچ آر سی پی کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈالی ہے کہ اِن ڈور اجلاس کے لیے نو آبجیکشن سٹیفکیٹ درکار ہے، حالانکہ یہ قانونی تقاضا نہیں ہے۔ دو حالیہ مثالوں میں عسکریت پسندی اور دہشت گردی کا سامنا کرنے والے خطوں اور انسانی حقوق پر ان کے اثرات کے بارے میں اسلام آباد میں ایک اعلیٰ سطحی مشاورت اور قدرتی وسائل پر مقامی آبادیوں کے حق پر گلگت میں گول میز کانفرنس شامل ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ دونوں تقریبات میں متعلقہ اراکین پارلیمان اور سرکاری محکموں نے اپنی شرکت کی تصدیق کی تھی۔

ملک بھر میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جہاں ہمارے اراکین اور عملے کو ہراسانی اور دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایچ آر سی پی کی دہائیوں پر محیط تاریخ میں پہلی بار، اس کے چیئرپرسن کو کراچی پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لیا۔

ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ ہے کہ دیگر اقدامات محض اتفاق نہیں ہیں۔ ان میں 2024 میں لاہور میں ہمارے دفتر کو بند کرنے کی کوشش، دفتر کے بجلی کے میٹر کو ہٹانا، اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی ایک ہدایت کا حوالہ دیتے ہوئے بینک کی جانب سے ہمارے فنڈز کے اجراء سے انکار شامل ہے۔ تاہم، جب عدالت نے ہدایت نامے کی بابت پوچھا تو اسٹیٹ بینک نے عدالت کو مطلع کیا کہ اس طرح کے ہدایت نامے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

ہم حکام پر زور دیتے ہیں کہ وہ انجمن سازی، اجتماع اور اظہار رائے کی بنیادی آزادیوں کا احترام کریں، اور یقینی بنائیں کہ انسانی حقوق کے دفاع کار انتقامی کارروائی یا بے جا مداخلت کے خوف کے بغیر کام کر سکیں۔ اگر پاکستان ایک ایسی ریاست بننا چاہتا ہے جو اپنے تمام شہریوں کے حقوق کو محفوظ رکھے اور ان کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار رہے تو ایچ آر سی پی جیسی سول سوسائٹی کی تنظیموں کا وجود ناگزیر ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انسانی حقوق کی جدوجہد سے ایک روادار اور شمولیتی معاشرے کے قیام میں مدد ملتی ہے جس کی پاکستان کو اِس وقت اشد ضرورت ہے۔

[پریس ریلیز۔ اسلام آباد۔ 02 جولائی 2025]

پنجاب میں سیاسی انتشار اور بڑھتی ہوئی ناانصافیاں باعثِ تشویش ہیں: ایچ آر سی پی

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے آج ایک پریس کانفرنس میں اپنی حالیہ رپورٹ 'پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال 2024' کے تناظر میں پنجاب میں انسانی حقوق کی صورتحال پر روشنی ڈالی۔

رپورٹ کے مطابق 2024 کے عام انتخابات میں ووٹروں کی تعداد اور ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا، لیکن مجموعی ٹرن آؤٹ میں کمی دیکھنے میں آئی۔ اگرچہ خواتین کی اسمبلیوں میں نمائندگی دوگنا سے بھی زیادہ ہوگئی، لیکن پنجاب اسمبلی بدستور خلل اندازی، اپوزیشن کی رائے کو نظر انداز کرنے اور عجلت میں قانون سازی جیسے مسائل کا شکار رہی۔ سال 2024 میں اسمبلی کی کارروائیاں شدید بدنظمی کا شکار رہیں۔ ایوان میں غیر مناسب حرکات کے خلاف خواتین ارکانِ اسمبلی نے واک آؤٹ کیا، جبکہ خواتین اور اقلیتوں کی مخصوص نشستوں کی الاٹمنٹ میں قانونی رکاوٹیں حائل رہیں۔

جون میں عجلت میں منظور کیے گئے پنجاب ہتکِ عزت ایکٹ 2024 کو انسانی حقوق کے نیٹ ورکس نے آزادیِ اظہارِ رائے پر قدغن قرار دیتے ہوئے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ بعدازاں اس قانون کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے لاہور ہائیکورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔ پنجاب حکومت نے اسلام آباد میں پی ٹی آئی کے احتجاج کو روکنے کے لیے سڑکیں بند کیں، جس سے سیاسی کارکنوں اور عام شہریوں دونوں کے نقل و حرکت کے حق کی خلاف ورزی ہوئی۔

مذہبی اقلیتوں کے خلاف مظالم کا سلسلہ بھی جاری رہا، جن میں سرگودھا میں ایک مسیحی شخص کی ہجوم کے ہاتھوں ہلاکت شامل ہے، جس پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا تھا۔ احمدی برادری نے منظّم امتیاز اور عدم تحفظ کے باعث انتخابی عمل مکمل دستبرداری اختیار کر لی۔

رپورٹ میں اس امر پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کہ کوئٹہ-تافتان شاہراہ پر پنجاب کے نو شہریوں کو قتل کر دیا گیا، جبکہ پنجگور، بلوچستان میں مبینہ شدت پسندوں کے حملے میں سات پنجابی مزدور جاں بحق ہوئے۔

ملک بھر میں بچوں سے بدسلوکی کے سب سے زیادہ کیسز پنجاب میں رپورٹ ہوئے۔ صرف جنوری تا جون 2024 کے دوران ملک بھر میں پیش آنے والے 1,630 واقعات میں سے 78 فیصد کا تعلق پنجاب سے تھا۔ اس عرصے میں جنسی زیادتی کے 2,506، اغوا کے 2,189، بچوں کی اسمگلنگ کے 457 اور جسمانی تشدد کے 455 واقعات درج ہوئے۔ فیصل آباد میں 11 سالہ گھریلو ملازمہ عائشہ کی ہلاکت اور سرگودھا و لاہور میں اسی نوعیت کے واقعات نے گھروں میں کم عمر ملازمین پر ہونے والے تشدد کو بے نقاب کیا۔

ذہنی معذور خواتین کے ساتھ جنسی تشدد، گھریلو تشدد کے نتیجے میں ہلاکتیں (جن میں حاملہ خواتین بھی شامل تھیں)، اور غیرت کے نام پر قتل کے واقعات سال بھر جاری رہے۔ لاہور کے ایک نجی کالج میں مبینہ زیادتی کے ایک واقعے میں ایچ آر سی پی نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں۔ لاہور ہائیکورٹ نے کم عمری کی شادی کی ممانعت کا ایکٹ 1929 میں عمر کی بنیاد پر صنفی تفریق کو آئین کے منافی قرار دیا، تاہم اس حوالے سے جامع قانون سازی تا حال تعطل کا شکار ہے۔

رپورٹ کے مطابق، مزدوروں کے حقوق اور ماحولیاتی مسائل کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ صفائی کے کارکنان بدستور خطرناک حالات میں کام کرنے پر مجبور رہے۔ دریں اثنا، صوبائی حکومت نے نومبر میں لاہور اور ملتان میں ریکارڈ کی گئی خطرناک آلودہ ہوا کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 17 جولائی 2025]

منطق الطیر

حارث خلیق

ہُد ہُد خوشی اور امید سے بھرپور پرندوں کے مجمع میں آگے آئی

معروف جنوبی ایشیائی دانشور، مصنفہ، محقق اور انسانی حقوق کی علمبردار، پروشی گوسوامی نے کہا: "غزہ کے ملبے تلے اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے تمام نظامات اور مغرب کی قیادت میں چلنے والی عالمی انسانی حقوق کی تحریک دفن ہو چکی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ جنوبی ایشیا کے دانشور اور انسانی حقوق کے کارکن، جو دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں، عالمی جنوب کے دیگر لوگوں کو ساتھ لے کر اس تحریک کو مکمل طور پر نوآبادیاتی اثرات سے پاک کریں اور اسے نئے سرے سے ترتیب دیں۔"

گزشتہ ویک اینڈ پر لاہور میں کئی برسوں کے وقفے کے بعد جنوبی ایشیا کے سات ممالک — افغانستان، پاکستان، بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا اور مالدیپ — سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، وکلا، ادیبوں، فنکاروں، صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں کا ایک زبردست، علمی اور جذباتی اجتماع ہوا۔ اس ملاقات کا مقصد خطے کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لینا اور آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

یہ ایک ہائبرڈ کانفرنس تھی جس کا عنوان تھا "رابطے، نہ کہ حدیں۔" اس میں چار ممالک کے نمائندے ذاتی طور پر شریک ہوئے، جبکہ متعدد مقررین نے آن لائن شرکت کی، جس کی ایک بڑی وجہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ویزے سے متعلقہ مسائل اور دیگر سفری پابندیاں تھیں۔ خوش قسمتی سے تکنیکی مسائل معمولی نوعیت کے تھے، اور دو روزہ اجلاس کے دوران حاضرین اور آن لائن شرکا بخوبی جڑے رہے۔

یہ کانفرنس جنوبی ایشیائی تنظیم برائے انسانی حقوق (SAHR) اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جانب سے ایچ آر سی پی کے دفتر میں واقع دوراب پٹیل آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی تھی۔

تقریب کا آغاز تیمور افغانی کی زبردست انداز میں ہیر وارث شاہ کے منتخب بندوں کی شاعرانہ قرات سے ہوا، جن کا ساتھ باکمال بانسری نواز اعجاز خان نے دیا۔ افتتاحی خطابات سیدہ سیدین حمید اور حنا جیلانی نے دیے، جو جذبات اور عقل مندی کا نایاب امتزاج تھے۔ ان دونوں نے تاریخ کا جائزہ لیا، خطے میں امن اور یکجہتی کی تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر بات کی، اور زور دیا کہ ہمیں سرحد پار امن کے لیے تحریکوں کو از سرِ نو زندہ کرنا ہوگا — چاہے وہ کشمیری ہوں، روہنگیا ہوں، یا افغانستان میں صنفی امتیاز کے متاثرین یا ماحولیاتی بحران کے شکار افراد۔





کانفرنس کے پہلے سیشن میں جنوبی ایشیا میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ کیا گیا۔ مجموعی تصویر یہی بنی کہ جمہوری اقدار زوال پذیر ہیں اور اظہار، اجتماع اور تنظیم سازی کی آزادیوں پر پابندیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

دوسرا سیشن تکثیریت اور مذہبی و نسلی اقلیتوں کے ممکنہ خاتمے پر مرکوز تھا۔ پہلے سیشن میں زمینی حقائق سے باخبر کارکن شریک تھے جبکہ دوسرا سیشن زیادہ نظریاتی تھا، جس میں اقلیتوں پر بڑھتے دباؤ کی وجوہات کا تجزیہ کیا گیا۔ ایک دلچسپ نکتہ یہ سامنے آیا کہ اکثریت اور اقلیت کے مفہوم کو صرف اعداد و شمار سے نہیں سمجھا جا سکتا — اصل بات طاقت کی ہے، سیاسی، سماجی اور معاشی غلبے کی۔ مثال کے طور پر، بھارت میں برہمن یا 1971 میں مغربی پاکستانی۔

تیسرے سیشن کا موضوع ماحولیاتی انصاف اور خطے میں مؤثر ماحولیاتی سفارت کاری تھا۔ شرکا متفق تھے کہ موسمیاتی تباہی سے بچنے کے لیے کوئی بھی ملک تنہا مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔ پورا ماحولیاتی نظام ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے، اور ہمیں مقامی برادری سے لے کر عالمی سطح تک مشترکہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

یہ بات بھی سامنے آئی کہ 21ویں صدی میں نصف سے زائد بے دخل ہونے والے افراد ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں، جبکہ گزشتہ صدی میں زیادہ تر نقل مکانی کی وجہ جنگیں تھیں۔

آخری سیشن میں بات چیت ہوئی کہ جدید ٹیکنالوجی اور ماضی کے آزمودہ طریقوں کو یکجا کر کے ایک علاقائی لائحہ عمل کیسے تیار کیا جا سکتا ہے۔ تمام ممالک کے نمائندے موجود تھے اور ایک واضح مطالبہ سامنے آیا کہ جنوبی ایشیائی تنظیم برائے علاقائی تعاون (سارک) کو دوبارہ فعال کیا جائے۔ نیپال اور سری لنکا کے شرکا نے زور دیا کہ بھارت کی بالادستی اور بھارت–پاکستان کشیدگی پورے خطے کو پیچھے لے جا رہی ہے۔

مقررین اور شرکا نے یہ بھی کہا کہ جنوبی ایشیائی ممالک کو اپنے اندرونی اور باہمی مسائل کو جلد از جلد حل کرنا ہوگا تاکہ وہ عالمی سطح پر مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

کانفرنس کا اختتام پاراچنار سے تعلق رکھنے والے مدثر حسین کی رباب پرفارمنس سے ہوا، جن کا ساتھ جنوبی وزیرستان کے محمد واصف نے دیا۔

اس اجلاس نے مجھے شیخ فریدالدین عطار کی فارسی نظم 'منطق الطیر' کی چند سطور یاد دلا دیں:

"ہُد ہُد خوشی اور امید سے بھرپور پرندوں کے مجمع میں آگے آئی۔ اس کے سینے پر وہ نشان تھا جو روحانی علم کے راستے پر چلنے کی علامت ہے؛ اس کے سر پر سچائی کا تاج سجا تھا اور وہ خیر و شر دونوں کا شعور رکھتی تھی۔"

پالیسی پیپر: بقا سے باعزت زندگی تک

کفافی اجرت (Living wage) کیوں ضروری ہے

ایک معقول اجرت کا تصور یہ ہے کہ مزدور اور ان کے خاندان کو بنیادی مگر مناسب معیار زندگی گزارنے، غربت کی لکیر سے اوپر رہنے اور معاشرے کے سماجی و ثقافتی زندگی میں موجودہ معاشی ترقی کے مطابق فعال طور پر شامل ہونے کے قابل بنایا جائے (دیکھیں اینکر، 2011)۔ یہ تصور متعدد اخلاقی اور فلسفیانہ سوالات کو جنم دیتا ہے، جن میں انسانی حقوق اور ایک معقول زندگی گزارنے کے حق جیسے مسائل بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے، معقول اجرت ایک بنیادی حق بن جاتی ہے جو محض بنیادی ضروریات پوری کرنے تک محدود نہیں بلکہ باعزت زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور دفعہ 23 میں ہر کارکن کے لیے معقول اجرت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

☆ ہر انسان کو کام کرنے کا حق حاصل ہے، نوکری کے انتخاب کی آزادی ہے، منصفانہ اور مناسب کام کے حالات کا حق ہے، اور بے روزگاری سے تحفظ کا حق ہے۔

☆ ہر شخص کو بلا امتیاز یکساں کام کے بدلے یکساں اجرت ملنی چاہیے۔

☆ ہر محنت کش کو اتنی اجرت ملنی چاہیے جو نہ صرف اس کی بلکہ اس کے خاندان کی ضروریات پوری کرے اور انسانی وقار کے لائق زندگی گزارنے کے قابل بنائے، نیز اگر ضرورت ہو تو سماجی بہبود کے دیگر ذرائع سے مدد ملے۔

☆ ہر شخص کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مزدور تنظیمیں (تجارتی اتحاد) بنانے اور ان میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔

معقول اجرت کے نفاذ کو متعدد دلائل کی بنیاد پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ ہمیں اقوام متحدہ کے متعین کردہ متعدد پائیدار ترقی کے اہداف کو پورا کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مثلاً، معقول اجرت کا نظام نافذ کرنے سے پہلے دو بڑے مقاصد غربت کا خاتمہ اور بھوک سے نجات حاصل کرنے میں براہ راست معاونت ملے گی یہ جبکہ باوقار روزگار کے فروغ (SDG 8) میں بھی معاون ہوگا۔ مزید برآں، اقوام متحدہ کا گلوبل کمپیکٹ، جو ایک کارپوریٹ پائیداری کا عالمی اقدام ہے اور جس میں پاکستان کی 100 سے زائد کمپنیاں شریک ہیں، کمپنیوں پر زور دیتا ہے کہ وہ زندہ اجرت کو باوقار روزگار کے ایک بنیادی عنصر کے طور پر فروغ دیں اور فراہم کریں۔ زندہ اجرت نہ صرف انفرادی اور خاندانی وقار سے جڑی ہوئی ہے بلکہ یہ مالکان کی اپنے ملازمین کے ساتھ ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتی ہے (Werner & Lim, 2016)۔

برسوں سے، نولبرل پالیسیوں اور اصلاحات نے حکومتوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے والی پالیسیوں کو اپنانا مشکل بنا دیا ہے۔ تجارت اور مالیات میں آزاد منڈی کی اصلاحات نے ترقی پذیر ممالک میں گھریلو صنعت اور زراعت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ مزید برآں، پاکستان میں لوگوں کی قوتِ خرید مہنگائی کی بلند شرح اور سست معاشی ترقی کی وجہ سے نمایاں طور پر کم ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، آبادی میں تیزی سے اضافہ اور موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات نے پاکستان کی متواتر حکومتوں کو نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے میں ناکام بنایا ہے۔

یونائیٹڈ نیشنز ڈیولپمنٹ پروگرام (یو این ڈی پی) کے انسانی ترقی کے اشاریے (ایچ ڈی آئی) کے مطابق، پاکستان کی ایچ ڈی آئی قدر 0.540 ہے، جو اسے انسانی ترقی کے لحاظ سے کم درجے والا ملک بناتی ہے۔ 193 ممالک میں سے ایچ ڈی آئی کی درجہ بندی میں پاکستان کا نمبر 164 ہے، جو کہ اس خطے میں صرف افغانستان اور نیپال سے بہتر ہے۔ افغانستان اور نیپال دونوں نے کئی سالوں تک پرتشدد حالات کا سامنا کیا، جب کہ پاکستان میں ایسی صورتحال نہیں رہی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، پاکستان کی تقریباً 40 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ ایک ایسی حکومتی پالیسی جو کم سے کم اجرت اور معقول اجرت (Living wage) کے فرق کو ختم کرے، غریبوں کو غربت سے نکالنے میں مدد دے سکتی ہے۔

ماحصل

ملک میں زندگی گزارنے کی لاگت جانچنے کے لیے صرف صارفانہ اخراجات کے سروے پر انحصار کرنے کے بجائے، ہم نے بین الاقوامی ادارہ محنت (آئی ایل او) اور ایشیائی لباس کارکن اتحاد (AFWA) کے تیار کردہ دو طریقہ کار کو ملا کر معیاری اجرت کا تخمینہ لگایا ہے۔ ہماری تخمینہ کاری خوراک کی قیمتوں اور دیگر متغیرات سے متعلق جمع کردہ ثانوی اعداد و شمار پر مبنی تھی۔ اس محدودیت کے باوجود، ہمارا معقول اجرت کا تخمینہ مناسب حد تک درست ہے۔ ہم نے تین بالغ اور تین بچوں پر مشتمل 6 رکنی خاندان کے لیے معقول اجرت کا تخمینہ لگایا، جس میں 1.5 بالغ افراد کام کرتے ہیں۔ ہم نے محنت کشوں کے لیے معقول اجرت کا تخمینہ لگانے کے دو طریقے استعمال کیے تاکہ ان کے خاندان کے افراد باعزت زندگی گزار سکیں۔ ہمارے دونوں تخمینے کافی قریب ہیں، لہٰذا واضح طور پر، ہم نے 51,424 روپے ماہانہ کے زیادہ تخمینے کو منتخب کیا۔

پالیسی سفارشات

معقول اجرت کے نفاذ کے لیے حکومتی مزدور پالیسی میں مداخلت کی ضرورت ہے۔ ہم حکومت کو معقول اجرت کے نفاذ کے لیے چار اہم شعبوں میں پالیسی سفارشات پیش کرتے ہیں۔

کم سے کم اجرت میں اضافہ کریں

حکومت کو زندگی کے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے کم از کم اجرت کا باقاعدہ جائزہ لینا چاہیے۔ نیز، علاقائی قیمتوں کے فرق کو بھی کم از کم اجرت کا تعین کرتے وقت مدنظر رکھنا چاہیے۔

اجتماعی مفاہمت کو مضبوط بنائیں

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی دفعہ 23 میں محنت کشوں کو تنظیم بنانے کا حق دیا گیا ہے۔ حکومت کو ضروری اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ محنت کش اتحاد بنا سکیں اور آجرین کے ساتھ معقول اجرت سمیت معاملات پر اجتماعی مفاہمت کا عمل انجام دے سکیں۔ پاکستان میں زیادہ تر محنت کش غیر رسمی شعبے میں کام کرتے ہیں، جہاں یونین سازی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حکومت کو غیر رسمی شعبے میں یونین سازی کو فروغ دینا چاہیے۔

منصفانہ لیبر پالیسیوں کو یقینی بنائیں

پاکستان میں مزدور (لیبر) قوانین کا ناقص نفاذ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ حکومت کو موجودہ مزدور (لیبر) قوانین کو مؤثر طریقے سے نافذ کرنا چاہیے۔ خاص طور پر، یہ یقینی بنایا جائے کہ تمام محنت کشوں کو کم از کم موجودہ قانونی اجرت ضرور ملے۔ اس کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو مل کر کام کرنا ہوگا، کیونکہ لیبر قوانین کا نفاذ صوبوں کی ذمہ داری ہے۔ لیبر کورٹس کو لیبر قوانین سے متعلق معاملات میں مزید مؤثر بنانا ایک اہم قدم ہوگا۔ حکومت کو یہ یقینی بنانا چاہیے کہ لیبر کوڈ کی خلاف ورزی کرنے والے کاروباریوں کو سزا ملے۔

روزمرہ کے اخراجات کو کم کرنے پر توجہ دیں/ اخراجاتِ زندگی سے متعلق مسائل کا حل تلاش کرنا

اگرچہ زندگی کے اخراجات کا تعلق معیشت کی مجموعی صورتحال سے ہے مگر حکومت کو کم آمدنی والے محنت کشوں کی فلاح و بہبود پر توجہ دینی چاہیے تاکہ بڑھتے ہوئے اخراجات کا بوجھ کم ہو سکے۔ یہ مقصد معیاری صحت، تعلیم اور عوامی نقل و حمل کی خدمات کو مؤثر اور کارگر طریقے سے فراہم کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گرمی، سیلاب اور طبقاتی ناانصافی کا موسم

زاہدہ حنا

یہ سب کچھ صرف فطرت کا قہر نہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی بھی ہے۔ ایک ایسا نظام جس نے ماحول کو بھی ایک منافع کی چیز بنا دیا ہے

کراچی میں لوگوں کے پسینے سے بھیگے ہوئے چہرے، لاہور میں بجلی سے محروم بستیاں، تھر میں خشک سالی اور گوادر کے پسے ہوئے ماہی گیر یہ سب چیخ چیخ کر ہمیں بتا رہے ہیں کہ یہ موسم صرف گرمی کا نہیں ظلم کا ہے، ناانصافی کا ہے، یہ صرف سورج کی آگ کا موسم نہیں، یہ طبقاتی ناانصافی کی دہکتی ہوئی آگ کا موسم ہے۔

زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے، سمندر بلند ہو رہے ہیں، آسمان سے کبھی سیلاب اترتے ہیں، کبھی قہر بن کر دھوپ برستی ہے لیکن کیا یہ آفات سب کے لیے برابر ہیں؟ کیا امیر اور غریب اس دھوپ میں ایک جتنے پگھلتے ہیں؟ کیا سیلاب کے پانی سب کے گھر ایک طرح بہا لے جاتے ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں۔

یہ کالم لکھتے ہوئے میرے سامنے وہ چھوٹا سا بچہ ہے جو لیاری کے ایک گندے نالے کے قریب کی بستی میں گرمی سے بے حال ہو کر ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ ماں اپنے پھٹے دوپٹے سے ہوا کر رہی ہے، بجلی کا کوئی امکان نہیں ہے اور دوسری طرف پوش ایریا کے ایک بنگلے میں اے سی کی ٹھنڈک سکون بخش رہی ہے۔ زمین ایک، موسم ایک، آسمان ایک لیکن زندگی کے پیمانے الگ الگ ہیں۔

پاکستان میں اس وقت موسم گرما صرف ایک فطری مظہر نہیں رہا، یہ ایک سماجی، اقتصادی اور طبقاتی بحران بن چکا ہے۔ جسے ہم ''کلائمیٹ چینج'' کہتے ہیں، اس کا اصل مطلب ہے قدرتی نظام کا انسان کے ہاتھوں بگاڑ لیکن اس بگاڑ کا بوجھ صرف وہی اٹھاتا ہے جس کے پاس بچنے کے ذرائع نہیں۔

تھر کے صحراؤں میں آج بھی وہی قحط ہے جو تیس برس پہلے تھا لیکن وہاں نہ تو کوئی ''کولنگ سینٹر'' کھلا ہے نہ ہی کوئی جدید سہولتیں موجود ہیں اور اگر کہیں کوئی NGO آ بھی گئی تو وہ بھی تصویریں کھینچ کر واپس چلی گئی۔ تھر کے بچے آج بھی کنویں کا گرم پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں جب کہ شہر میں بچے منرل واٹر کی بوتل سے پانی پیتے ہوئے منہ بناتے ہیں کہ پانی ٹھنڈا نہیں۔

حکومتیں بدلتی رہیں، نعرے بدلتے رہے لیکن جن کے چولہے دھوپ میں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اُن کے دن کبھی نہیں بدلے۔ اب آیئے سیلاب کی طرف، جولائی کا مہینہ ہے، مون سون کی بارشیں شروع ہو چکی ہیں۔ خیبر پختونخوا سے لے کر سندھ کے نشیبی علاقوں تک پانی نے پھر سے بستیاں بہا دی ہیں، مگر ان پانیوں میں بھی امتیاز ہے، جو کوٹھیاں پہاڑوں پر بنی ہیں، وہ محفوظ رہتی ہیں، جو جھونپڑیاں ندی کے کنارے ہیں، وہ بہہ جاتی ہیں۔ جو لوگ کشتی خرید سکتے ہیں، وہ بچا لیے جاتے ہیں جن کے پاس صرف دعائیں ہیں، وہ ڈوب جاتے ہیں۔

دو ہزار بائیس کے تباہ کن سیلاب کو ہم نے ایک سبق بنانا تھا لیکن ہم نے اسے صرف ایک خبر بنا دیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے مگر کیا آج اُن کے لیے مستقل گھر بنائے گئے؟ کیا ان کے بچوں کو اسکول علاج یا روزگار ملا؟ نہیں بس چند راشن کے تھیلے، کچھ سوشل میڈیا پر تصویریں اور پھر خاموشی۔ وہی پرانا سبق کہ غریب کا دکھ خبر بنتا ہے مگر اس کا حل کبھی نہیں آتا۔

یہ کالم لکھتے ہوئے میرے سامنے وہ چھوٹا سا بچہ ہے جو لیاری کے ایک گندے نالے کے قریب کی بستی میں گرمی سے بے حال ہو کر ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ ماں اپنے پھٹے دوپٹے سے ہوا کر رہی ہے، بجلی کا کوئی امکان نہیں ہے اور دوسری طرف پوش ایریا کے ایک بنگلے میں اے سی کی ٹھنڈک سکون بخش رہی ہے۔ زمین ایک، موسم ایک، آسمان ایک لیکن زندگی کے پیمانے الگ الگ ہیں۔

یہ سب کچھ صرف فطرت کا قہر نہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی بھی ہے۔ ایک ایسا نظام جس نے ماحول کو بھی ایک منافع کی چیز بنا دیا ہے۔ جنگلات کاٹ کر ہاؤسنگ سوسائٹی بنائی جاتی ہے، ندیوں کا راستہ روک کر شاپنگ مال کھولے جاتے ہیں، پہاڑوں کو کاٹ کر ہائی وے بنتی ہے اور جب زمین چیخنے لگتی ہے تو الزام کسی اور پر لگا دیا جاتا ہے۔ موسمیاتی تبدیلی کا تعلق صرف کاربن سے نہیں بلکہ انسانی رویوں سے ہے۔ جب ہم زمین کو صرف دولت بنانے کا ذریعہ سمجھیں گے تو وہ کبھی نہ کبھی اپنا حساب لے گی اور یہ حساب ہمیشہ کمزوروں سے شروع ہوتا ہے۔

ہمیں سوچنا ہوگا کیوں گرمی سے سب سے زیادہ مزدور مرتے ہیں؟ کیوں سیلاب میں سب سے پہلے کسان بہتے ہیں؟ کیوں بجلی کی بندش کا اثر سب سے زیادہ ان گھروں پر ہوتا ہے جہاں جنریٹر نہیں؟ کیوں واٹر ٹینکر صرف ان علاقوں میں جاتا ہے جہاں ادائیگی ہو سکتی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب



ہے کیونکہ ہم نے ایک ایسا سماج بنا لیا ہے جہاں انسان کی قدر اس کے سرمائے سے ہے، اس کی جاگیر سے ہے، اس کے بجلی کے بل ادا کرنے کی استطاعت سے ہے۔ جہاں زندگی ایک تجارتی شے بن چکی ہے، امیروں کے لیے قابلِ حفاظت، غریبوں کے لیے قابلِ فراموش۔

ان حالات میں امید کی کرن کہاں سے آئے؟ وہ تب آئے گی جب ہم یہ مان لیں کہ ماحولیاتی انصاف سماجی انصاف کے بغیر ممکن نہیں۔ جب ہم مان لیں کہ ایک ہرے بھرے درخت کو بچانا صرف ماحولیاتی اقدام نہیں بلکہ ایک سیاسی اور طبقاتی عمل ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں کہ تھرپارکر کے لیے پانی کا مطالبہ بھی اتنا ہی انقلابی ہے جتنا اسلام آباد میں آئینی حقوق کی بات۔

یہی وقت ہے کہ محنت کش، کسان، طلبہ، اساتذہ اور وہ سب جنھوں نے ہمیشہ حالات کے تھپیڑے کھائے وہ اپنی آواز بلند کریں، صرف نعرے کے طور پر نہیں، ایک اجتماعی سیاسی طاقت کے طور پر۔ ایک ایسی تحریک جو یہ مانے کہ کارخانے کے دھوئیں سے لے کر ایئر کنڈیشنڈ دفاتر تک ہر جگہ کا ماحولیاتی بوجھ غریب کے کندھے پر پڑ رہا ہے۔

گرمیوں کے دن گزر جائیں گے، بارشیں بھی تھم جائیں گی لیکن جو سوال ہمیں آج تپتی ہوئی سڑکوں سے بھاگتے ہوئے سیلابی پانی سے اور تاریکی میں ڈوبے گھروں سے پوچھنا چاہیے، وہ ہمارے ضمیر کا امتحان ہے۔ کیا ہم یہ خاموشی برداشت کریں گے؟ کیا ہم مان لیں گے کہ کچھ لوگوں کو جینے کا حق صرف اس لیے نہیں کہ ان کے پاس اے سی یا جنریٹر نہیں؟ یا ہم اٹھ کھڑے ہوں گے ایک ایسے نظام کے خلاف جو زمین کو بھی بیچ دیتا ہے اور انسان کی سانس کو بھی؟ مجھے امید ہے کہ ایک دن گرمی کا یہ موسم نہیں بدلے گا، بلکہ نظام بدلے گا۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

”دنیا میں بچے صبح سکول جاتے ہیں، ہماری لڑکیاں جاگتے ہی پانی کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں“

خالدہ نیاز

"دنیا بھر میں بچے صبح کو سکول جاتے ہیں لیکن ہماری لڑکیاں نیند سے جاگتے ہی پانی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ گھر میں پینے کو پانی نہیں ہوتا اور اسے پورا کرنا خاندان کی عورتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔"

یہ کہنا ہے ضلع مہمند کی رہائشی رابعہ کا جن کا گاؤں 'بنگلو کلے' تحصیل ہیڈکوارٹر یکہ غنڈ سے 20 کلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ ان کے علاقے میں بجلی ہے نہ پینے کا صاف پانی جس کے لیے یہاں خواتین گھڑے سر پر اٹھائے روزانہ گھنٹوں پیدل سفر کرتی ہیں۔ انہیں گھر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کئی کئی کلومیٹر دور سے پانی لانا پڑتا ہے۔

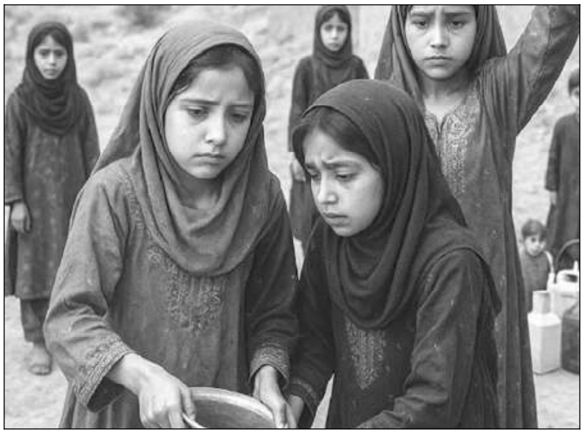
مہمند ہی کی تحصیل صافی کے گاؤں زیارت میں فہمیدہ گدھے کو ہانکتی چلی آ رہی ہیں جس پر تین گیلن پانی لدا ہے۔ انہوں نے خود بھی پانی کے دو مٹکے (ایک سر اور دوسرا بغل میں) اٹھا رکھے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ دریائے سوات یہاں سے صرف سات کلومیٹر پر ہے مگر گاؤں میں پینے کو پانی نہیں۔ لوگ بہت تکلیف میں ہیں لیکن عورتوں کی کون سنتا ہے؟" علاقے میں ٹیوب ویل ہیں نہ کوئی سرکاری واٹر سپلائی سکیم۔ کچھ لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کنویں کھود کر سولر پلیٹیں لگا رکھی ہیں۔ ہم وہیں سے پانی لیتے ہیں۔" صرف تحصیل یکہ غنڈ اور صافی ہی نہیں، گرمیوں میں پانی کی قلت کے باعث غلنئی اور گنداؤ کے دیہات کا یہ حال ہوتا ہے کہ لوگ لوئر مہمند کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دو دریاؤں کے درمیان پیاسے لوگ، سکولوں تک میں پانی دستیاب نہیں

دریائے کابل اور دیائے سوات کے درمیان واقع ضلع مہمند کے لوگ ماضی میں بارش سے ری چارج ہونے والے روایتی کنوؤں اور چشموں کا پانی استعمال کرتے تھے جو نا صرف پینے بلکہ ان کی کھیتی باڑی کی ضروریات بھی پوری کرتا تھا۔

پھر آبادی بڑھنے کے ساتھ جنگلات کم ہوتے چلے گئے اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگے۔ اب اس ضلعے کی آبادی لگ بھگ پانچ لاکھ 54 ہزار ہو چکی ہے جس کو پانی کے سنگین مسائل کا سامنا ہے۔

انٹرنیشنل کنزرویشن آف نیچر (آئی سی یو این) کی ایک رپورٹ کے مطابق مہمند میں زیرزمین پانی کی سطح (واٹر ٹیبل) اوسطاً 94 فٹ تک نیچے جا چکی ہے۔ یہاں زیرزمین پانی کی کوالٹی بھی اچھی نہیں جبکہ ضلعے کی 67 فیصد آبادی کنوؤں کا پانی استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ ضلع مہمند میں کنوؤں کے بعد پانی کی دستیابی کا دوسرا بڑا ذریعہ پبلک ہیلتھ انجینیئرنگ کا واٹر سپلائی سسٹم ہے جو عام طور پر شہری علاقوں تک محدود ہے۔ گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج چندہ کی پرنسپل ماہ رخ طاہر کلائمیٹ چینج کے حوالے سے بھی متحرک رہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مہمند کے کئی علاقوں میں تو پانی بالکل ہی نہیں جس کی وجہ سے بعض دیہات ویران ہو گئے ہیں۔



کچھ آبادیوں میں لوئر مہمند سے واٹر سپلائی کا سسٹم شروع کیا گیا ہے لیکن وہاں بھی پانی دو تین روز بعد چند منٹوں کے لیے آتا ہے جس سے ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ یہاں سکولوں تک میں پینے کا پانی دستیاب نہیں ہوتا۔ اکثر بچے گھروں کا پانی بھرنے کے لیے سکول ہی نہیں آتے اور جو آتے ہیں وہ بھی واپس جا کر بالٹیاں پکڑے سرکاری پانی کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔

مہمند میں شرح خواندگی پہلے ہی کم ہے، پانی کی قلت تعلیم میں مزید رکاوٹ بن چکی ہے

مہمند کے ایک سرکاری سکول کی ٹیچر سنبل معاذ کہتی ہیں کہ پانی کی قلت یہاں خواتین خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم و صحت کو شدید متاثر کر رہی ہے۔ ایک تو یہاں تعلیم پہلے ہی کم ہے، اوپر سے مائیں اپنی بیٹیوں کو سکول کی بجائے پانی کے لیے ساتھ لے جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔

آخری مردم شماری (2023ء) کے مطابق ضلع مہمند میں خواندگی کی شرح تقریباً 31 فیصد ہے جبکہ عورتوں میں صرف 15 فیصد ہے۔ اگر اس ضلع کے پانی کی قلت کا شکار علاقوں کو دیکھا جائے تو تحصیل صافی کی خواتین میں شرح خواندگی محض آٹھ فیصد اور یکہ غنڈ میں لگ بھگ 26 فیصد ہے۔ سنبل معاذ کے بقول دور سے پانی لانے کے دوران راستے میں لڑکیوں کو اکثر ہراسگی کا خوف رہتا ہے جو ان کی نفسیات پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ دوسرا بچیاں جب بھاری مٹکوں سمیت پہاڑیاں چڑھتی اترتی ہیں تو کم عمری ہی میں انہیں کمر درد جیسے مسائل شروع ہو جاتے ہیں۔

ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر غلنئی کی سماجی کارکن دلراز بتاتی ہیں کہ یہ خشک پہاڑوں کا علاقہ ہے جن پر کوئی سبزہ نہیں اور بارشیں بھی کم ہوتی ہیں۔ شبقدر سے اوپر پانی لانے کے لیے ایک پائپ لائن بچھائی گئی جو بمشکل شہری علاقے کی ضروت پوری کرتی ہے۔ "اس واٹر سپلائی سے دیہات تو کجا شہر کے گردونواح میں بھی پانی نہیں پہنچتا۔ یہاں خواتین کو کنوؤں سے مٹکوں اور مشکیزوں میں پانی لانا پڑتا ہے۔ انہیں ریلیف دینے کے لیے ان علاقوں میں پانی کا انتظام ہونا بہت ضروری ہے۔" تاہم مہمند سے منتخب رکن خیبر پختونخوا اسمبلی محبوب شیر اعتراف کرتے ہیں کہ مہمند میں پینے پانی کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ تاہم وہ اس کے حل کے لیے کوشاں ہے اور علاقے میں کئی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔

ضلع کو واٹر سپلائی کی فراہمی کے کئی منصوبے ابھی محض دعوں تک ہی محدود ہیں

محبوب شیر بتاتے ہیں کہ ضلعے میں 175 کنویں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے غیر فعال تھے ان کی سولرائزیشن کی منظوری ہو چکی۔ اب کچھ کنویں فعال ہیں اور باقی بھی جلد فعال ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایم این اے ساجد مومند نے اپنے دور میں دریائے کابل سے خویزی بایزی کے لیے فزیبلٹی رپورٹ تیار کرائی تھی جس کا تخمینہ چار ارب روپے لگایا گیا۔ ان بقول یہ ورلڈ بینک کا پراجیکٹ ہے جو جلد شروع ہو گا۔ تاہم ایکسیئن پبلک ہیلتھ انجینئرنگ کامران آفریدی بتاتے ہیں کہ مذکورہ منصوبہ پانچ سال میں مکمل ہو گا جس سے خویزو بایزی کے 50 ہزار لوگوں کو پانی ملے گا۔

ان کا کہنا تھا کہ واٹر سپلائی کے مختلف منصوبوں سے لوگوں کو کچھ حد تک ریلیف بھی ملا ہے۔ جیسا کہ سروکلی سے غلنئی تک پائپ لائن مکمل ہو چکی ہے جس سے 50 ہزار آبادی کو پانی دستیاب ہوا ہے۔

ایم پی اے محبوب شیر کے مطابق واٹر سپلائی کا دوسرا ایک بڑا پراجیکٹ مہمند ڈیم سے متعلقہ ہے۔ جب ڈیم پر ابتدائی بات ہو رہی تھی تو معلوم ہوا کہ اس سے تین تحصیلیں پنڈیالی، امبار اور پڑانگ غار زیادہ متاثر ہوں گی۔

"مجھ سمیت منتخب نمائندوں نے انتظامیہ سے کہا کہ ان تحصیلوں میں پانی کا مسئلہ زیادہ ہے اس لیے پہلے یہاں واٹر سپلائی کو یقینی بنائی جائے۔" انہوں نے دعویٰ کیا کہ مہمند ڈیم واٹر سپلائی منصوبے پر سات ارب روپے لاگت آئے گی جس میں سے دو ارب روپے ڈیم والے (واپڈا) دیں گے اور بقایا رقم صوبائی حکومت دے گی۔ یہ معاہدہ ہوا ہے۔ تاہم ایکسیئن کامران آفریدی کا کہنا ہے کہ مہمند ڈیم واٹر سپلائی پر نو ارب روپے خرچ ہوں گے جس میں سے واپڈا نے دو ارب کی حامی بھری ہے۔ تاہم باقی رقم کے لیے کوئی ڈونر نہیں مل رہا۔

(بشکریہ لوک سجاگ)

بلاسفیمی بزنس گینگ (مبینہ) کے ہاتھوں برباد ماؤں کی پریس کانفرنس

سلیم ملک

یہ سوالات صرف وکلا یا متاثرین کے نہیں، بلکہ ہر انصاف پسند پاکستانی کے ہیں

پاکستان جیسے مذہبی جذبوں سے لبریز ملک میں توہینِ رسالت ایک نہایت حساس اور نازک موضوع ہے۔ اسی جذباتیت کی وجہ سے بلاسفیمی قوانین بہت اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔لیکن جب یہی قانون کچھ طاقتور افراد کے ہاتھ میں بلیک میلنگ اور پیسے بٹورنے کا ہتھیار بن جائے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کہاں ہے؟ انصاف کہاں ہے؟

حال ہی میں ایک ہولناک انکشاف نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ جسے ''بلاسفیمی بزنس گینگ'' کا نام گیا دیا ہے۔اس گروہ پر الزام ہے کہ یہ مختلف علاقوں سے نوجوان لڑکوں کو ہنی ٹریپ کر کے یا جاب کا جھانسا دے کر اسلام آباد یا لاہور بلاتے ہیں۔ یہاں پر انہیں اغوا کر لیتے ہیں۔ان کے موبائل فون چھین لیتے ہیں اور ان کے فونز پر بلاسفیمی والا مواد ڈال دیتے ہیں۔ یہی بلاسفیمی والا مواد کی بنیاد پر انہیں بلیک میل کرتے ہیں اور ان سے رقوم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انکار کی صورت میں ان پر توہینِ رسالت کے جھوٹے مقدمات دائر کر کے جیلوں میں بند کروا دیتے ہیں۔اس طریقے سے پھنسائے گئے نوجوانوں کی تعداد چار سو سے بھی زیادہ ہے۔

یہ محض افواہ نہیں۔ دو خودمختار رپورٹیں، ایک اسپیشل برانچ کی، اور دوسری نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی، ان الزامات کی تصدیق کرتی ہیں۔نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن نے پاکستان کی مختلف جیلوں میں بند ترانوے نوجوانوں کا انٹرویو کیا تھا۔ ان رپورٹوں کی بنیاد پر اسلام آباد ہائی کورٹ میں متاثرہ فیملیز کی جانب سے درخواست دائر کی گئی کہ معاملے کی غیر جانبدار تحقیقات کے لیے ایک آزاد تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے۔

عدالت یہ کمیشن بنانے کا حکم دینے ہی والی تھی کہ بلاسفیمی بزنس گینگ کے لوگ گھبرا کر بیچ میں آ گئے اور آزاد تحقیقاتی کمیشن بنانے کی مخالفت کر دی۔ سماعت شروع ہوگئی تو حسب معمول بلاسفیمی بزنس گینگ نے درجن بھر وکیل عدالت کے اندر اور سینکڑوں کے جتھے عدالت کے باہر لا کھڑے کیے۔ انصاف پر مبنی فیصلہ تو دور کی شنوائی ہی ناممکن بنانے کی کوشش کی۔ اس دفعہ والے جج صاحب ثابت قدم رہے اور انہوں نے عدالتی کارروائی کو لائیو آن لائن دکھانے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ عدالت کی بقیہ کارروائی پر سکون رہی اور ساری دنیا نے غور سے دیکھی۔ بلاسفیمی بزنس گینگ کا بھانڈا تو چوراہے میں پھوٹ گیا۔

عدالت نے ایک سال کی طویل سماعت کے بعد کمیشن کے قیام کا حکم دیا۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر الزامات تھے، وہ خود اسی فیصلے کے خلاف عدالت جا پہنچے۔اگر ان کے دامن صاف تھے، تو کمیشن سے کیوں بھاگے؟ اگر وہ بےقصور تھے، تو کھل کر اپنی صفائی کیوں نہ پیش کی؟ یا کیوں اپنی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے۔

یہ سوالات صرف وکلا یا متاثرین کے نہیں، بلکہ ہر انصاف پسند پاکستانی کے ہیں۔

پریس کانفرنس میں موجود ماؤں کی آوازیں زخموں سے چور تھیں۔ کوئی ماں اپنے بیٹے کی لاش وصول کر چکی تھی، کسی کا بیٹا بغیر کسی جرم کے کئی سال سے جیل میں سڑ رہا ہے۔ وہ تمام مائیں گڑگڑا کر صرف ایک مطالبہ کر رہی تھیں کہ کمیشن بننے دو، سچ سامنے آنے دو، گناہ گار کو سزا دو اور بے گناہ کو رہائی دو۔

یہ محض افواہ نہیں۔ دو خودمختار رپورٹیں، ایک اسپیشل برانچ کی، اور دوسری نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی، ان الزامات کی تصدیق کرتی ہیں۔نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن نے پاکستان کی مختلف جیلوں میں بند ترانوے نوجوانوں کا انٹرویو کیا تھا۔

کیا یہ مطالبہ بھی جرم ہے؟ کیا انصاف مانگنے والوں پر فتویٰ لگانا ہی رہ گیا ہے؟ کیا معاشرے میں اتنی بے حسی آ گئی ہے کہ ماؤں کی چیخیں بھی ضائع جا رہی ہیں؟

رپورٹوں اور سماعت کی روشنی میں یہ تاثر راسخ ہوتا ہے کہ یہ صرف 35 افراد کا کوئی عام گروہ نہیں، بلکہ ایک منظم گینگ ہے جو ریاستی اداروں، سائبر کرائم اور چند مذہبی طبقات سے مدد لے کر نوجوانوں کو جال میں پھنساتا ہے، ان پر جھوٹے مقدمات دائر کرتا ہے، اور پھر سوشل میڈیا پر انہیں گستاخِ رسول قرار دے کر عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بناتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ عدالت کے سوالات کے نتیجے میں گینگ کے ممبران، ان کے وکلا اور ایف آئی اے کے افسران کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ایف آئی اے نے واٹس ایپ گروپوں کے ایڈمنز کی شناخت کرنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی اور کسی شکایت کنندہ کے موبائل کا فرانزک نہیں کرایا گیا۔ اور اس ناقص تفتیش کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لڑکوں نے صرف نوکری کے وعدے پر اعتماد کیا تھا، وہ آج توہین رسالت جیسے سنگین الزام کے تحت قید میں سڑ رہے ہیں۔

متاثرہ ماؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیاستدان، علما، اور ریاستی ادارے خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ جبکہ یہ معاملہ صرف ان کا نہیں، ہر پاکستانی ماں، باپ، اور نوجوان کا ہے۔ کل کو یہ ظلم کسی اور کے دروازے پر بھی دستک دے سکتا ہے۔

ان معصوم لڑکوں پر 295 سی جیسے حساس قانون کا اطلاق صرف ایک جعلی لنک یا ایک چیٹ پر کر دینا، بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے، نہ صرف قانون کی روح کے منافی ہے بلکہ پوری پاکستانی قوم اور ریاست کے لیے باعث شرمندگی ہے۔

پریس کانفرنس میں موجود وکلا اور ماؤں کا مشترکہ مطالبہ صرف اتنا ہے:

''ہم عاشقِ رسول ﷺ ہیں، ہم اس قانون کے حامی ہیں، لیکن اس کا غلط استعمال روکنا ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کمیشن بنے، تحقیقات ہوں، اور جو بھی قصوروار ہو۔ چاہے متاثرہ فریق ہو یا الزام لگانے والا۔ اُسے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔''

ہم آخر کب تک خاموش رہیں گے؟

☆ کیا صرف ایک ڈیوائس، ایک لنک، یا ایک چیٹ اس بات کا جواز ہے کہ کسی نوجوان کو گستاخِ رسول قرار دے کر اس کی زندگی تباہ کر دی جائے؟

☆ کیا ریاست ان 400 سے زائد قیدیوں کی آہوں سے بےخبر رہے گی؟

☆ کیا انصاف صرف طاقتور کے لیے ہے؟

اب وقت ہے کہ ہم بحیثیت قوم آنکھیں کھولیں۔ ہم مذہب کے نام پر ''بلاسفیمی بزنس گینگ'' جیسے جرائم پیشہ عناصر کے ہاتھوں یرغمال نہ بنے رہیں۔

ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ

☆ اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق آزاد تحقیقاتی کمیشن فوری طور پر قائم کیا جائے

☆ تمام متاثرہ خاندانوں کو تحفظ، وکالت اور مالی معاونت فراہم کی جائے۔

نوٹ: یہ پریس کانفرنس 24 جولائی 2025 کو اسلام آباد پریس کلب میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے نوٹس اور اس آرٹیکل کے بنیادی ڈرافٹ کا کچھ حصہ اے آئی کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس فائنل ڈرافٹ کی ذمہ داری میری ہے۔

(بشکریہ ہم سب)

’’صرف گولی سے مارنے کی اجازت ہے‘‘

توصیف احمد خان

بلوچستان کی حکومت نے بھی اس وڈیو پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے علاقے اور قبیلے کا نام ظاہر نہیں کیا تھا

’’صرف گولی سے مارنے کی اجازت ہے۔‘‘ گل بانو ستکزئی نے براہوی زبان میں یہ الفاظ ادا کیے۔ پھر کسی مرد کی آواز آئی، ’’ان سے قرآن مجید لے لو۔‘‘ بانو نے ان الفاظ کو ادا کرنے سے پہلے یہ بھی کہا کہ ’’مجھ سے سات قدم دور رہو‘‘ بانو کے بھائی نے گولی چلائی۔ پہلے بانو زمین پر گری، پھر اس کے شوہر احسان کو گولیاں ماری گئیں۔ اس جوڑے کا صرف قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔

اس جوڑے کے قتل کا واقعہ کوئٹہ سے 40 میل دور ڈکاری کے مقام پر رونما ہوا جہاں پولیس کی عملداری نہیں ہے۔ گزشتہ ہفتے اس جوڑے کے قتل کی وڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی تو دنیا بھر کو قبائلی معاشرے کی فرسودہ روایات کے بھیانہ اثرات کا علم ہوا۔ اس بھیانک قتل کی واردات کی کسی کو فوری اطلاع نہ ہوئی۔ کوئٹہ کے ایک صحافی کا کہنا ہے کہ اس جوڑے نے چھپ کر اپنی پسند کی شادی کی تھی مگر اس علاقے میں موجود نہیں تھے۔

اس دوران علاقے کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ احسان کو لڑکی کے اغواء پر قتل کیا جائے مگر دوسری طرف یہ کہا گیا کہ لڑکی اپنی مرضی سے شادی پر تیار ہوئی ہے تو پھر دونوں کو قتل کرنے پر بزرگوں کا اتفاق ہوا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ احسان نے اپنے قبیلے کے سردار کے پاس پناہ لی ہوئی تھی مگر اس جوڑے کو دعوت کے نام پر بلایا گیا اور وہاں انھیں قتل کا فیصلہ سنایا گیا۔ جب یہ وڈیو وائرل ہوئی تو اس وڈیو میں لڑکی اور لڑکے کے نام کچھ اور بتائے گئے تھے۔

اس قبیلے اور وقوع کے مقام کا نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ بلوچستان کی حکومت نے بھی اس وڈیو پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے علاقے اور قبیلے کا نام ظاہر نہیں کیا تھا مگر جب سوشل میڈیا پر یہ مطالبہ مسلسل آنے لگا کہ علاقے اور قبیلے کا نام ظاہر کیا جائے تو بعض صحافیوں نے اس قبیلے اور اس مقام کی نشاندہی کی۔ بلوچستان کی حکومت نے دعویٰ کیا ہے کہ اب تک تیرہ افراد کو گرفتار کیا گیا ہے مگر وزیراعلیٰ کا نیا موقف یہ ہے کہ قبیلے کا سردار شیر باز ستکزئی اس جرم میں ملوث نہیں ہے۔

90ء کی دہائی میں انسانی حقوق کمیشن HRCP کی سابق چیئرپرسن حنا جیلانی اور عاصمہ جیلانی کے لاہور میں قائم کردہ شیلٹر ہوم میں پشاور کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی نے پناہ لی ہوئی تھی کیونکہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر اپنی مرضی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس لڑکی کی ماں جو ڈاکٹر تھیں، ایک شخص کے ساتھ اس لڑکی سے ملنے آئی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی، ان کے ساتھ آئے شخص نے اس لڑکی پر گولی چلائی۔ اس شخص کی دوسری گولی سے حنا جیلانی بال بال بچ گئیں۔ حنا کے دفتر پر تعینات پولیس کانسٹیبل نے جوابی گولی چلائی۔ اجرتی قاتل بھی مارا گیا مگر تمام تر کوششوں کے باوجود لڑکی کی ماں کو گرفتار نہیں کیا گیا، اس زمانے میں مسلم لیگ ن کی حکومت تھی۔ پیپلز پارٹی کے بیرسٹر اعتزاز احسن اور بیرسٹر اقبال حیدر سینیٹر تھے۔ انھوں نے اس واقعے کی مذمت کی قرارداد سینیٹ میں پیش کی تھی۔

صرف ایم کیو ایم کے حمایت یافتہ معروف شاعر جمیل الدین عالی نے قرارداد کی حمایت کی تھی۔ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے سابق سیکریٹری جنرل اور عوامی نیشنل پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ترقی پسند ادیب اجمل خٹک بھی سینیٹر تھے مگر وہ بھی اس لڑکی کے قتل کی مذمت کی قرارداد کی حمایت پر تیار نہیں ہوئے۔ یوں یہ قرارداد اکثریتی ووٹ حاصل نہ کرسکی۔

2008 میں جب پیپلز پارٹی کے یوسف رضا گیلانی وزیراعظم اور آصف علی زرداری صدر تھے تو ان کی مخلوط کابینہ میں اسرار زہری بھی وزیر تھے۔ زہری کا تعلق بلوچستان کے ایک بڑے قبیلے سے تھا۔ اس وقت چھ لڑکیوں کو بلوچستان میں زندہ دفن کرنے کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ وزیر موصوف نے کہا تھا کہ ’’یہ تو ہماری روایات کے مطابق ہے۔‘‘ اس وقت حاصل بزنجو زندہ تھے، انھوں نے اس وقت واقعے کی شدید مذمت کی تھی اور کہا تھا کہ ’’وزیر موصوف نے بلوچ روایات کے برعکس یہ موقف پیش کیا ہے۔‘‘

یہ رسم ہزاروں سال سے جاری ہے۔ سندھ، بلوچستان، جنوبی پنجاب اور خیبر پختونخوا میں اب بھی اس رسم پر عمل کیا جاتا ہے اور اس عمل کو غیرت کے نام پر قتل کہا جاتا ہے۔ جب انگریز آئے تو انگریزوں نے ستی کی رسم اور کاروکاری کو غیر آئینی عمل قرار دیا تھا مگر کاروکاری کے مرتکب افراد کو سزا دینے کے لیے سخت قوانین نافذ نہیں کیے۔ انگریز حکومت نے 1860 میں کاروکاری کو جرم قرار دیا تھا مگر اس کی سزا کم رکھی تھی۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے 1990 میں اس بارے میں قوانین میں ترمیم کی اور اس کو شریعت کے مطابق بنایا۔ 1999 میں انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی کی کہ کاروکاری کے بارے میں قوانین کمزور ہیں اور حکام ان معاملات میں ملزمان کو سزائیں دلوانے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ بین الاقوامی اداروں کے دباؤ پر دسمبر 2004 میں حکومت نے اس قانون میں ترمیم کی۔ نئے قانون کے تحت غیرت کے نام پر قتل کرنے والے افراد کو 7 سال عمر قید تک کی سزا تجویز کی گئی۔

2005 میں حکومت پاکستان نے ایک ایسے قانون کے مسودے کو مسترد کیا، جس میں کاروکاری کے مجرموں کی سزا میں اضافے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ 2006 میں خواتین کے تحفظ کا قانون نافذ ہوا۔ اس قانون کے تحت کاروکاری کے مجرموں کو عمر قید کی سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا، 2010 میں (Criminal Law Amendment Offences in the name of pretext of honour) نافذ ہوا۔ اس قانون کے تحت سزا یافتہ مجرم کو قریبی رشتے داروں کی جانب سے معافی دینے کا اختیار ختم کیا گیا۔ اس قانون کے تحت اب مجرموں کو 14 سال تک قید کی سزا ہوسکتی ہے۔

انسانی حقوق کمیشن HRCP کی کونسل رکن سعدیہ بلوچ اپنی کتاب میں اپر سندھ کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ’’جب فصل کٹتی ہے تو کوئی بھی شخص اپنے کسی دشمن سے انتقام لینے کے لیے خاتون یا لڑکی کو قتل کرتا ہے، پھر اپنے دشمن کو قتل کرکے یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ناجائز تعلقات کی بناء پر اپنی قریبی عزیزہ اور دشمن کو قتل کیا ہے۔‘‘ ایک اور رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ سندھ میں کاروکاری میں قتل ہونے والے افراد کو نہ تو کفن دیا جاتا ہے نہ ان کی نمازِ جنازہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو کسی دور افتادہ مقام پر دفن کیا جاتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کی متحرک استاد ڈاکٹر عرفانہ ملاح اور پروفیسر امر سندھو نے اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ انھوں نے کاروکاری ہونے والی خواتین کی قبریں دیکھی ہیں۔ کاروکاری کے فیصلے جرگے میں ہوتے ہیں۔ جرگے میں صرف مرد شرکت کرتے ہیں۔ قبیلوں کے سردار اور عمائدین ہر فیصلے پر قادر ہوتے ہیں۔ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے تحت جرگے کے انعقاد پر پابندی ہے مگر ملک بھر میں جرگے ہوتے ہیں۔

کئی جرگوں میں وزراء، منتخب اراکین، اعلیٰ پولیس افسران تک بھی شریک ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق کمیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال بھی 392 خواتین کاروکاری کے الزام میں قتل ہوئیں۔ ایسے مقدمات کی پیروی کرنے والی وکیل حنا جیلانی نے بتایا ہے کہ کاروکاری کے مقدمات کی عدالتوں میں شنوائی کی شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے اور شاذ و نادر ہی اس جرم میں کسی شخص کو سزا ہوتی ہے۔

بلوچستان کے وزیراعلیٰ نے قتل ہونے والی عورت اور مرد کے متعلق جو نیا بیانیہ اختیار کیا ہے، اس سے جرم کی سنگینی میں کمی کرنے کا تاثر ملتا ہے۔ کوئٹہ کے ایک صحافی کا کہنا ہے اس مقتولہ کے جنازے میں سیکڑوں افراد کی شرکت سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ علاقے کے لوگ گل بانو کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ بلوچستان کے تناظر میں سب سے اہم بات یہ کہ بلوچستان میں انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی تنظیم بلوچ یکجہتی کمیٹی اس قتل کے خلاف بھرپور احتجاج کرے۔ غیرت کے نام پر قتل کی روایت اس وقت ختم ہوگئی جب پدرشاہی نظام ختم ہوگا۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

خاندانی منصوبہ بندی کا اصل مفہوم

اسرارالدین اسرار

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ یہ اکائی اگر ٹیڑھی ہے تو معاشرے کی پوری عمارت لامحالہ ٹیڑھی ہے

گزشتہ دنوں وفاقی وزارت صحت نے گلگت میں علماء کانفرنس کا انعقاد کیا جس کا مقصد خاندانی منصوبہ بندی پر آگاہی دینا تھا۔ سیمنار میں سیر حاصل تقریریں ہوئیں تاہم خاندانی منصوبہ بندی پر بہت کم اور دبے الفاظ میں بات ہوئی۔ سیمنار کے مہمان خصوصی گورنر گلگت بلتستان تھے ان کا چند جملوں پر مشتمل مختصر ترین خطاب تھا۔ جس میں انہوں نے صرف منتظمین کو شاباش دی اور شکریہ ادا کیا۔ موضوع پر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسندوں پر بیٹھے ہوئے ارباب اختیار خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ یہ اکائی اگر ٹیڑھی ہے تو معاشرے کی پوری عمارت لامحالہ ٹیڑھی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی صرف بچوں کی تعداد کم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک صحت مند، کارآمد، ترقی پسند، خوشحال، ہنرمند، تعلیم یافتہ اور مثالی خاندان کی تشکیل ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ شادی مناسب عمر میں سوچ و بچار کے ساتھ کی جائے، ازدواجی رشتے کو ابتداء سے ہی درست سمت میں ڈالا جائے جس کی تیاری شادی سے قبل کی جائے، بچوں کی پیدائش سے قبل میاں بیوی اور خاص طور سے بیوی کی جسمانی و ذہنی صحت کو ترجیح دی جائے تا کہ ان سے صحت مند بچے پیدا ہو سکیں، بچے پیدا کرنے سے پہلے ان کی تعداد کا تعین کیا جائے، بچوں کی پیدائش سے قبل اپنی معاشی حالت کا ادراک کیا جائے اور اس بات کی سمجھ حاصل کی جائے کہ والدین کے پاس کتنے بچے پالنے کی استعداد موجود ہے تا کہ ان کی تعلیم، صحت، رہن سہن، خوراک، کپڑے سمت دیگر ضروریات زندگی کا بہتر انتظام کیا جا سکے، ان کی تربیت کی سمت کا تعین کیا جا سکے، ان کو ایک مثبت اور کارآمد انسان بنانے کے لئے وسائل بروئے کار لائے جا سکیں، بچوں کو زندگی کے ہنر سکھانے کے بارے میں منصوبہ بندی کے علاوہ ان کی بہتر زندگی سے متعلق ہر ممکن اقدامات کیے جا سکیں۔

اس سارے عمل میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کم عمری کی شادی جان لیوا اور آئندہ نسل کے لئے نقصان دہ ہے کیونکہ کم عمر لڑکی کے اندر ماں بننے کے لئے درکار خون کی مقدار اور مضبوط جسمانی و ذہنی قوت نہیں ہوتی اس لئے اس سے پیدا ہونے والا بچہ جسمانی و ذہنی طور پر کمزور ہو سکتا ہے بلکہ کم عمر لڑکی ماں بنتے وقت خود زندگی کی بازی ہار سکتی ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں شادی کی کم از کم عمر اٹھارہ سال مقرر کی گئی ہے۔ کم عمر جوڑا ذہنی طور پر پختہ نہیں ہوتا اس لئے وہ والدین کی اصل ذمہ داری نبھانے میں ناکام ہوتا ہے، وہ بچوں کی معاشی و تربیتی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح زبردستی کی شادی بھی دنیا بھر میں غیر قانونی اور خاندان کی تشکیل کے لئے مضر تصور ہوتی ہے کیونکہ جس خاندان میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو وہ خاندان ذہنی صحت کے مسائل سے دوچار ہونے کے علاوہ گھریلو تشدد اور خاندانی چپقلشوں کا شکار رہتا ہے۔

ماو?ں کی تولیدی صحت بھی خاندانی منصوبہ بندی کا اہم حصہ ہے جس کے تحت بچوں کی پیدائش میں وقفہ، ماں کی صحت کو دیکھ کر ڈاکٹر کے مشورے سے بچہ جنم دینے کا ارادہ کرنا، ماں کے اندر کتنے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اس کا تعین کرنا اور سب سے اہم یہ کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد ماں کو اکیلے بچے کی دیکھ بھال کی ذمہ داریاں سونپنا ان کی ذہنی و جسمانی صحت کو متاثر کر سکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ باپ ان کے شانہ بشانہ بچے کی پیدائش کے بعد ان کی دیکھ بھال کے فرائض میں شامل رہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ بچہ اور ماں کے نیوٹریشن کی ضروریات کو اولین ترجیح دی جائے۔ حمل کے دوران ماں کو خوشی کے ماحول میں رکھا جائے اور متوازن غذا فراہم کی جائے۔

پاکستان کا بحثیت ایک ملک سب سے اہم مسئلہ اس وقت بڑھتی آبادی ہے جو کہ ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن ہے۔ وسائل تیزی سے کم ہو رہے ہیں جب کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بجلی، پانی، آٹا، گیس، زمین، روزگار اور دیگر ضروریات زندگی میں کمی آ رہی ہے۔ جب کہ لوگ تسلسل کے ساتھ بچے پیدا کرتے جا رہے ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق سالانہ پچاس لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک بن گیا ہے۔ جبکہ ترقی کے عمل میں تیزی سے پیچھے جا رہا ہے۔ صنفی و گھریلو تشدد، تعلیم وصحت سے محروم آبادی، بڑھتی غربت، بڑھتے جرائم، دہشت گردی، بے روزگاری سمیت دیگر تمام مسائل کا اس غیر منظّم، غیر ہنر مند اور بے ہنگم آبادی سے گہرا تعلق ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بڑھتی آبادی کو نہیں روکا گیا اور بہتر خاندانی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تو آنے والے سالوں میں پاکستان ایک گرداب میں پھنس سکتا ہے جس سے نکلنا مشکل ہوگا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا تعلق نہ صرف افراد کی انفرادی و خاندانی زندگی سے ہے بلکہ ملکی ترقی سے بھی ہے۔

پاکستان کی اکثریت آبادی میں کامیاب شادی یا خاندانی منصوبہ بندی کی آگاہی نہیں ہے جس کی وجہ سے خاندانوں میں مسائل جنم لیتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ بیٹا بگڑا ہے تو اس کی شادی کروا دی جائے وہ ٹھیک ہوگا۔ جو لڑکا پہلے سے بگڑا ہے اس پر خاندان جیسے بنیادی اور اہم ادارے کی ذمہ داری ڈالنا بیوقوفی ہے۔ اسی طرح بے روزگاروں کی شادی اس غلط فہمی میں کر دی جاتی ہے کہ شادی کے بعد وہ آباد ہوگا۔ وہ آباد تو نہیں ہوتا تاہم دو بے روزگار مل کر دس نئے بے روزگار پیدا کرتے ہیں جن کو بھیک مانگنے یا جرائم کے ارتکاب کے لئے سڑک پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

یہ بات لوگوں کو سمجھانے کی ہے کہ شادی کسی عیاشی کا نام نہیں بلکہ ایک اہم ذمہ داری کا نام ہے جس کو احسن طریقے سے نبھانے کے لئے تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس عمل میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا جائے تو ایک خاندان متاثر ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اکثریت آبادی کو خاندانی منصوبہ بندی کی آگاہی نہ ہونا تشویشناک ہے ہی مگر حکومت اور ذمہ دار اداروں کا اس ضمن میں سنجیدہ کوششیں نہ کرنا اس سے زیادہ تشویشناک امر ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں نے وعظ و نصیحت سے آبادی پر قابو نہیں پایا ہے بلکہ بہترین پالیسیوں سے آبادی کو کنٹرول کیا اور اس کو صحیح سمت میں ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آبادی بے ہنگم ہجوم نہیں بلکہ مہذب، کارآمد اور ذمہ دار شہریوں پر مشتمل ایک منظّم معاشرہ ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ وفاقی وصوبائی حکومتیں خاندانی منصوبہ بندی کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے ادارے کو فعال کرنے کے علاوہ اس کی سرگرمیوں کو ہمہ جہت بنیادوں پر وسیع کرنا ہوگا۔ چند اہم قوانین کو فوری پاس کر کے ان کو نافذ العمل کرنا ہوگا جن میں کم عمری کی شادی کے خلاف قانون، ماں اور بچے کی صحت کے حقوق کا قانون، شادی کے فوری بعد یا اس سے قبل جوڑے کی کونسلنگ کا قانون، والدین کی تربیت کا قانون اور زبردستی کی شادی کے خلاف قانون شامل ہیں۔ (بشکریہ ہم سب)

مہم: بقا سے باعزت زندگی تک

کسی بھی شخص کو اپنے بلوں کی ادائیگی، گھر میں روٹی کمانے اور اپنے بچوں کو سکول بھیجنے کے درمیان انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کے اعلامیہ برائے انسانی حقوق کی شق 23 کے تحت، ہر محنت کرنے والے کو منصفانہ اور موزوں معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، جو اُس کے اور اُس کے خاندان کے لیے ایسی زندگی کو یقینی بنائے جو انسانی وقار کے شایانِ شان ہو۔

☆ **غیر محفوظ رہائش**
☆ **ناکافی خوراک**
☆ **تعلیم یا دوا کے لیے ناکافی رقم**
☆ **وقار پر سمجھوتہ**

یہ صرف معاشی مسئلہ نہیں—یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ محنت کش ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، لیکن انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے کفافی اجرت (Living wage) کوئی عیش وعشرت نہیں۔ یہ ایک حق ہے جو بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین میں تسلیم شدہ ہے اور ایک منصفانہ معاشرے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی لیے ایچ آر سی پی ایک ایسی مہم کے ساتھ ملک بھر کا سفر کر رہا ہے جو اثر انگیز کہانیوں اور عوامی عمل کو یکجا کرتی ہے۔

ہم نے GazdarAisha@ کی ہدایت کاری میں ایک دستاویزی فلم تیار کی ہے جو زندہ رہنے کے لیے کفافی اجرت کے حق کی وکالت کرتی ہے، ہم ملک بھر میں ٹریڈ یونینز اور مزدوروں کے لیے اس کی نمائشیں کا انعقاد کر رہے ہیں۔

ہم سول سوسائٹی کے اراکین کے ساتھ پینل مباحثوں کا انعقاد کر رہے ہیں تاکہ کم از کم اجرت اور زندہ رہنے کے لیے کفافی اجرت کے فرق کو آسان الفاظ میں واضح کیا جاسکے، اور یہ کہ یہ فرق کم آمدنی والے خاندانوں کے لیے عملی طور پر کیا معنی رکھتا ہے۔

یہاں درج ذیل آٹھ طریقوں سے 28 جولائی سے 8 اگست کے درمیان، آپ ہماری مہم کی حمایت کر سکتے ہیں:

1۔ فلم "باعزت روزگار: ہر خاندان کا حق" کی ریلیز سے متعلق تازہ ترین معلومات کے لیے فالو کریں۔ فلم ریلیز ہونے کے بعد اسے یوٹیوب پر دیکھیں اور سوشل میڈیا، واٹس ایپ گروپس اور کمیونٹی پلیٹ فارمز پر زیادہ سے زیادہ شیئر کریں۔

2۔ اپنے اسکول، دفتر یا محلے میں ایک چھوٹی سی نمائش (اسکریننگ) کا اہتمام کریں تاکہ اس موضوع پر جامع گفت وشنید کا آغاز کیا جاسکے۔



کیا ایک خاندان 40,000 روپے میں گزارا کر سکتا ہے؟

صوبائی حکومتوں کی جانب سے مقرر کردہ کم از کم ماہانہ اجرت بمشکل 40,000 روپے ہے۔ لیکن کیا یہ رقم چھ افراد پر مشتمل ایک خاندان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہے؟ قومی اعداد و شمار کی بنیاد پر، یہاں موازنہ پیش کیا گیا ہے کہ ایک خاندان کو صرف زندہ رہنے کے لیے کیا درکار ہے، اور کم از کم اجرت میں وہ اپنی کون سی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

گھرانے کے ماہانہ اخراجات	اصل اخراجات (اندازاً)	کیا 40,000 روپے میں ممکن ہے؟
خوراک	34,711	نہیں۔ تقریباً کچھ بھی باقی نہیں بچتا
کرایہ (دو کمروں کا مکان)	11,335	بمشکل۔ کرایہ 30 فیصد سے زائد بنتا ہے
بچوں کی تعلیم	1,172	اکثر چھوڑ دی جاتی ہے
طبی سہولیات	1,348	خود علاج یا علاج میں تاخیر
یوٹیلیٹی بلز (بجلی، گیس)	4,196	بل کا جھٹکا، بے قاعدہ استعمال
ٹرانسپورٹ	1,163	پیدل سفر یا کرایہ ادھار لینا
تفریح	853	ناممکن

یہ رقم باعزت زندگی گزارنے کے لیے ناکافی ہے۔
محنت کشوں کو ایسی اجرت ملنی چاہیے جو مہنگائی، بنیادی ضروریات اور اُن کی محنت کی قدر کو مدنظر رکھے۔
کفافی اجرت (LIVING WAGE) کوئی رعایت نہیں، بلکہ ایک حق ہے۔

لِوینگ ویج 75,000 روپے ماہانہ سے کم نہیں ہونی چاہیئے

HRCP پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

Funded by the European Union

3۔ اپنے منتخب نمائندوں اور مقامی حکومتی عہدیداروں کو خط لکھ کر مطالبہ کریں کہ وہ ہماری پالیسی دستاویز "بقا سے عزت تک" میں پیش کردہ شواہد کی روشنی میں، افراطِ زر اور معیارِ زندگی کے اخراجات سے منسلک منصفانہ اجرت کی قانون سازی یقینی بنائیں۔

4۔ نیچے دیا گیا ہمارا معلوماتی فلائر شیئر کریں اور ہیش ٹیگز جیسے Living Wage Now# اور From Survival To Dignity# کا استعمال کریں۔ پالیسی سازوں، صحافیوں اور سماجی کارکنوں کو ٹیگ کریں۔

5۔ اپنے خاندان، ساتھیوں یا کمیونٹی کے ساتھ بات کریں کہ درحقیقت ''معقول اجرت کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ غلط فہمی دور کریں کہ کم از کم تنخواہ بقاء کے لیے کافی ہے۔

6۔ مزدور اتحاد اور غیر رسمی کارکنوں کے نیٹ ورکس کی حمایت کریں یا ان سے روابط قائم کریں۔ ان کی آواز بلند کرنے میں مدد کریں اور جامع مکالمے کے لیے وکالت کریں۔

7۔ مزدوروں کی جدوجہد اور معاشی حقوق کو اجاگر کرنے کے لیے اخبارات میں مضامین یا خطوط لکھیں اور ان موضوعات پر مزید کوریج کا مطالبہ کریں۔

8۔ ان ہڑتالوں، دھرنوں یا احتجاج کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کریں جو منصفانہ تنخواہ، محفوظ کام کے حالات، اور مزدوروں کے حقوق کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

پنجاب میں ترقی کے دعوے اور انسانی حقوق کی صورتحال

یوسف بینجمن

پنجاب میں مذہبی اقلیتیں انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کا شکار ہیں

پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا اور گنجان آباد صوبہ ہونے کے ناتے ملک کی ترقی اور معیشت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ تاہم اس ترقی اور خوشحالی کے بظاہر روشن سائے میں انسانی حقوق کی صورتحال کئی افسوسناک اور سنگین چیلنجز سے دوچار ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) نے 22 جولائی 2025 کو اپنی سال 2024 کی صورتحال کا احاطہ کرتی تازہ ترین رپورٹ میں پنجاب میں سیاسی بدانتظامی، بڑھتی ہوئی ناانصافیوں اور انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزیوں پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ یہ رپورٹ صوبے میں بنیادی حقوق کی پامالی سے لے کر اقلیتوں کے تحفظ، آزادی اظہار رائے پر قدغن سے لے کر صنفی بنیاد پر تشدد تک کے متعدد مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔

رپورٹ نمایاں طور پر اس بات پر تشویش کا اظہار کرتی ہے کہ پنجاب میں سیاسی بدانتظامی اور بڑھتی ہوئی ناانصافیاں انسانی حقوق کی مجموعی صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا رہی ہیں۔ یہ صورتحال نہ صرف ریاستی اداروں کی کارکردگی بلکہ شہریوں کو انصاف کی فراہمی پر بھی سنگین سوالات اٹھاتی ہے۔

اگرچہ رپورٹ میں پنجاب میں جبری گمشدگیوں کے کوئی مخصوص اعداد و شمار شامل نہیں مگر یہ مسئلہ ملک بھر میں ایک تشویشناک حقیقت بنا ہوا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں مسلسل اس انسانی پامالی پر آواز اٹھاتی رہی ہیں۔ صوبے میں 'پولیس مقابلوں' کے نام پر ہونے والے ماورائے عدالت قتل بھی ایک سنگین مسئلہ ہیں، جہاں قانون کی حکمرانی کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

رپورٹ کے مطابق پنجاب سمیت پورے پاکستان میں آزادی اظہار رائے پر قدغنیں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ پریوینشن آف الیکٹرانک کرائمز (ترمیمی) ایکٹ 2025 (PECA Act 2025) جسے 29 جنوری 2025 کو نافذ کیا گیا، اسے صحافیوں اور عام شہریوں کی آواز کو دبانے کے ایک خطرناک حربے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ صحافیوں کو دھمکیوں، ہراساں کرنے اور جسمانی حملوں کا سامنا رہا ہے، جس کے نتیجے میں خود سنسرشپ میں اضافہ ہوا ہے اور آزاد صحافت کے لیے جگہ سکڑ گئی ہے۔ رپورٹ میں پنجاب حکومت کے ڈیفیمیشن لاء کو بھی میڈیا کی آزادی کے لیے ایک سنگین خطرہ قرار دیا گیا ہے۔

پنجاب میں مذہبی اقلیتیں انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کا شکار رہیں۔ تضحیکِ مذہب کے قوانین کا غلط استعمال ایک بڑا چیلنج رہا، اکثر ذاتی رنجشوں کی بنیاد پر جھوٹے الزامات لگا کر اقلیتی افراد کو نشانہ بنایا گیا۔ سرگودھا کا المناک واقعہ جہاں 70 سالہ مسیحی بزرگ نذیر مسیح کو ہجوم کے تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا، اس صورتحال کی ایک لرزہ خیز مثال ہے۔



اس تازہ ترین رپورٹ میں پنجاب میں خواتین کے خلاف بڑھتے ہوئے جنسی تشدد، خاص طور پر ذہنی معذوری کا شکار خواتین کے ساتھ، اور گھریلو تشدد جس کے نتیجے میں حاملہ خواتین سمیت کئی ہلاکتیں ہوئیں، پر گہری تشویش ظاہر کیا گیا ہے۔ سال بھر غیرت کے نام پر قتل کا سلسلہ بھی جاری رہا۔



رپورٹ کے مطابق، ملک بھر میں بچوں سے بدسلوکی (child abuse) کے سب سے زیادہ کیسز پنجاب میں رپورٹ ہوئے۔ صرف جنوری تا جون 2024 کے دوران ملک بھر میں پیش آنے والے 1,630 واقعات میں سے 78 فیصد کا تعلق پنجاب سے تھا۔ اس عرصے میں جنسی زیادتی کے 2,506، اغوا کے 2,189، بچوں کی اسمگلنگ کے 457 اور جسمانی تشدد کے 455 واقعات درج ہوئے۔ فیصل آباد میں 11 سالہ گھریلو ملازمہ عائشہ کی ہلاکت اور سرگودھا و لاہور میں اسی نوعیت کے واقعات نے گھروں میں کم عمر ملازمین پر ہونے والے تشدد کو بے نقاب کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929 میں عمر کی بنیاد پر صنفی امتیاز کو غیر آئینی قرار دینے کے باوجود، وسیع تر قانون سازی میں اصلاحات کا عمل سست روی کا شکار ہے۔

انسانی حقوق کی اس حالیہ رپورٹ میں مزدوروں کے حقوق کو نظرانداز کرنے اور ماحولیاتی حالات کی ابتری کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ صفائی کے شعبے سے وابستہ کارکنان کو خطرناک حالات میں کام کرنا پڑا، جس سے ان کی جان کو خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، صوبائی حکومت لاہور اور ملتان میں خطرناک حد تک بڑھتی ہوئی اسموگ (smog) کی سطح کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی، جس سے انسانی صحت اور بنیادی حقوق متاثر ہوئے۔

یہ رپورٹ پنجاب میں انسانی حقوق کی ایک سنگین اور کثیر جہتی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف موجودہ حکومت کے لیے بلکہ تمام ریاستی اداروں، سول سوسائٹی اور عوام کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ سیاسی بدانتظامی کا خاتمہ، آزادی اظہار رائے کی مکمل ضمانت، اقلیتی برادریوں اور کمزور طبقات کو موثر تحفظ کی فراہمی، خواتین اور بچوں کے حقوق کا دفاع، اور ماحولیاتی تحفظ کو یقینی بنانا وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ پنجاب میں انسانی حقوق کی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے گہری سیاسی بصیرت، مصمم ارادے، جامع قانونی اصلاحات، اور عدالتی نظام میں شفافیت ناگزیر ہے۔ یہ ایک مشکل سفر ضرور ہے، لیکن یہ ایسا سفر ہے جو ایک منصفانہ، محفوظ اور انسانی وقار پر مبنی معاشرے کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ (بشکریہ ہم سب)

غیرت کے سوداگر

ثمرین شیخ

غیرت۔۔۔؟ نہیں یہ کوئی مقدس جذبہ نہیں رہا بس بندوق اٹھانے کا جواز بن گیا ہے، قبر کھودنے کی وجہ اور عورت کو حقِ انکار پر صادر ہونے والی خاموشی کا فرمان۔

ہماری غیرت کا المیہ یہ ہے کہ جو لڑکی کے اسکول جانے پر جاگ اٹھتی ہے، وراثت میں حصہ مانگنے پر طیش میں آجاتی ہے اور محبت کرنے پر گولی بن کر دل میں اتار دی جاتی ہے۔ ساری عمر مذہبی ہونے کا دعوہ کرنے والے کیوں بھول جاتے ہیں۔

شریعت، قانون اور اقوام متحدہ سب عورت کو اس کے حقوق دیتے ہیں لیکن خاندان، جرگہ، باپ اور بھائی اپنے سے وابستہ عورت کی زندگی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔

غیرت ایک لفظ جسے ہم نے تقدس کی چادر میں لپیٹ دیا، مگر اس کے نیچے بہتے آنسو اور خون آلود قبریں چھپا دی گئیں۔

زیادہ نہیں تو چند عرصہ پیچھے جائیں تو ہمیں غیرت کے نام پر گولی کھانے والی بنت حوا کی ایک طویل فہرست مل جائے گی جن میں سے چند یہ ہیں:

ڈغاری، بلوچستان میں احسن اللہ اور بانو بی بی دونوں خاندان کے انکار کے بعد اپنی محبت کی خاطر اپنا علاقہ اپنا گاؤں سب چھوڑ کر گئے اور ڈیڑھ سال بعد ان کے گھر والے انہیں دھوکے سے بلاتے ہیں کہ ہم تم دونوں کو قبول کرتے ہیں اور جرگے کے فیصلے کے مطابق دونوں پر گولیاں چلا دیتے ہیں۔ اس عورت کے آخری الفاظ "صرف گولی چلانے کے اجازت ہے" ان زمینی خداؤں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اسلام آباد میں 17 سالہ ٹک ٹاکر ثنا یوسف جسے اس کے گھر میں گھس کر اس کے کزن عمر حیات نے گولیوں کا تختہ دے دیا نہ صرف اس کی "آزادی" اور "آن لائن شناخت" جرم بن گئی بلکہ اس کے انکار نے بھی اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیا۔ اس کیس کو بھی غیرت سے مشروط کرنے کی کوشش کی گئی۔

راولپنڈی میں ایک باپ نے بیٹی کو صرف اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس نے محض ایک موبائل ایپ ٹک ٹاک ایپ ڈیلیٹ کرنے سے انکار کیا تھا۔

کیا عورت کی سانس بھی اب خاندان کی مرضی سے چلے گی؟

کیا "نہیں" کہنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا موت ہے؟ کیا تعلیم، محبت، شناخت سب جرم ہیں اگر کرنے والی عورت ہے؟

کیا عزت صرف لڑکی سے جڑی ہوئی ہے اور مرد؟ وہ صرف فیصلے کر سکتا ہے چاہے غیرت جگا کر گولی کا ہو یا قبر کا؟

حقیقت یہ ہے کہ 2024 میں پاکستان میں 32,617 صنفی تشدد کے کیسز رپورٹ ہوئے۔ عزت کے نام پر قتل کرنے والوں میں سے 90 فیصد چھوٹ گئے، کیوں؟ کیونکہ قاتل وارث ہی ہوتا ہے اور وارث مجرم (خود) کو معاف کر دیتا ہے۔

یہ کہانی کسی اور کی نہیں ہر اس بیٹی، ہر اس بہن کی ہے جو "نہیں" کہتی ہے، جینے کی خواہش کرتی ہے، اپنی پہچان بنانے کی کوشش کرتی ہے، محبت کو جرم نہیں سمجھتی اور اپنی قبر خود کھود لیتی ہے۔

یہ صرف سسٹم نہیں ایک جہالت ہے، ایک ظلم ہے جسے صرف قانون نہیں آواز، قلم اور سچ توڑ سکتا ہے۔

کیونکہ بات اب صرف غیرت کی نہیں انسانیت کی ہے۔

خاموش مردانگی: پاکستان میں متجنس مردوں کی ان کہی کہانی

مصباح ناز

یہ ایک ایسی کہانی ہے جو نہ کبھی مکمل کہی گئی اور نہ ہی سنجیدگی سے سنی گئی۔ یہ اُن افراد کی کہانی ہے جنہیں دنیا نے لڑکی کہہ کر پکارا، لیکن ان کا دل، ان کی روح اور ان کی شناخت مسلسل یہ کہتی رہی کہ "میں مرد ہوں"۔ پاکستان میں ان افراد کو متجنس مرد کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں پیدائش کے وقت عورت کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے، لیکن وہ اپنی ذات کو مرد کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔

اس ملک میں، جہاں عورت ہونا بذاتِ خود ایک جدوجہد ہے، وہاں ایک لڑکی کی پرورش پانے والے مرد کی تکلیف کا تصور بھی مشکل ہے۔ بچپن سے پردہ، نرمی، شرم، چپ رہنے کی تلقین، حرکتوں پر پابندیاں، اور ہر قدم پر سماجی بندشوں کا سامنا۔ وہ اندر سے مرد ہوتا ہے لیکن دنیا اسے لڑکی سمجھ کر اُس پر عورتوں کے تمام پیمانے لاگو کر دیتی ہے۔

پھر ایک دن وہ ہمت کر کے دنیا کے سامنے مرد کے طور پر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن وہی معاشرہ جو مردانگی کا جشن مناتا ہے، اُسی مردانگی کو رد کر دیتا ہے جب وہ کسی متجنس مرد سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسے مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس کے لباس، آواز، اور انداز کو طنز سے ناپا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے: کیا مرد بننا صرف اُس کو حق ہے جو پیدائش کے وقت مرد تسلیم کر لیا گیا ہو؟

پاکستان میں خواجہ سرا کمیونٹی کے لیے اگرچہ ایک منظم سماجی ڈھانچہ موجود ہے — جیسے گرو و چیلے کا نظام، کچھ قانونی شناخت، اور سوشل سپورٹ — لیکن متجنس مردوں کے لیے ایسا کوئی نظام موجود نہیں۔ خواجہ سرا برادری صرف ان افراد کو اپنا حصہ مانتی ہے جو خود کو تیسری جنس کے طور پر شناخت کرتے ہیں، جبکہ متجنس مرد خود کو مکمل طور پر مرد تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے نہ وہ مردوں کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں، نہ ہی خواجہ سرا برادری انہیں قبول کرتی ہے۔ یوں وہ سماجی خلا میں تنہا کھڑے رہتے ہیں۔

ریاستی سطح پر بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ٹرانس جینڈر پرسنز (پروٹیکشن آف رائٹس) رولز 2020 کے مطابق نادرا صرف X جینڈر مار کر کے ساتھ شناختی کارڈ جاری کرتا ہے۔ متجنس مرد X جینڈر کو قبول نہیں کرتے کیونکہ وہ تیسری جنس کے طور پر خود کو شناخت نہیں کرتے۔ وہ اپنے کارڈ پر 'مرد' کی شناخت چاہتے ہیں، لیکن انہیں یہ حق بھی نہیں دیا جاتا۔

سب سے دل دہلا دینے والی حقیقت یہ ہے کہ کئی متجنس مردوں کو زبردستی اُن مردوں سے بیاہ دیا جاتا ہے جو ان کی اصل شناخت سے لاعلم ہوتے ہیں۔ یہ شادیاں اکثر جبری ہوتی ہیں، اور ان میں کئی افراد ازدواجی زیادتی کا شکار بنتے ہیں۔ ان کے پاس نہ قانونی سہارا ہوتا ہے نہ سماجی تحفظ۔ نہ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی شناخت کے حق میں بات کر سکتے ہیں۔

2023 میں ایسوسی ایٹڈ پریس نے لاہور کے ایک نوجوان امان کی کہانی شائع کی، جو کہ ایک متجنس مرد ہے۔ اُس کے اہلِ خانہ نے اسے مسترد کر دیا۔ وہ بے سہارا ہو گیا۔ نہ کوئی کمیونٹی تھی، نہ قانونی تحفظ، نہ روزگار، نہ عزت۔ یہ صرف امان کی نہیں، بلکہ پاکستان کے بے شمار متجنس مردوں کی کہانی ہے۔

ان کی خاموشی اب مزید برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ان کے لیے علیحدہ قانونی شناخت، سپورٹ سسٹم، طبی سہولیات، روزگار کے مواقع اور سماجی تحفظ کا بندوبست ضروری ہے۔ ان کی مردانگی کو تسلیم کیا جانا چاہیے، نہ کہ اسے شک، نفرت یا طنز کا نشانہ بنایا جائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی کمیونٹی، بغیر کسی آواز اور بغیر کسی شنوائی کے زندہ ہیں۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ان کی خاموش مردانگی کو آواز دی جائے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

نعمان یاور

یہ وقت ہے آئینہ دیکھنے کا۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے اندر جھانکیں اور سوچیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟

میرے ذہن میں آج برسوں پرانا ایک منظر تازہ ہو گیا۔ میرا بھتیجا، وجدان، ان دنوں کینیڈا میں زیرِ تعلیم تھا، دسویں جماعت کا طالب علم۔ اس کے مرحوم والد ایک بااصول اور نظریاتی سیاسی کارکن تھے، جنہوں نے اپنی زندگی بائیں بازو کی سیاست، جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے وقف کر دی۔ شاید یہی شعور وجدان میں بھی منتقل ہوا تھا۔ وہ جب چھٹیوں میں پاکستان آیا تو ایک نشست میں اُس نے اپنے مشاہدات ہم سے بانٹے۔

کہنے لگا، "میرے کلاس فیلوز مجھ سے اکثر پاکستان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ جب میں کچھ بتاتا ہوں تو ان کا ردعمل حیران کن ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں پاکستان افغانستان جیسا ملک ہے، جہاں قبائلی نظام اور مذہبی قدامت پسندی کا غلبہ ہے۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن بعض واقعات میری دلیل کو جھٹلا دیتے ہیں۔"

مجھے اس کی باتیں اس وقت کچھ جذباتی سی لگیں، لیکن آج جب بلوچستان میں ایک نوجوان جوڑے کو پسند کی شادی کرنے پر پہلے دھوکے سے بلایا گیا، جرگے نے سزا سنائی، اور پھر سرِعام گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا تو وجدان کی باتیں پھر سے کانوں میں گونجنے لگیں۔

ہم جدیدیت، ترقی، انسانی حقوق اور آزادی جیسے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ ہر فورم پر ہم روشن خیالی کا پرچم تھامے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی جڑیں اب بھی قبائلی سوچ میں پیوست ہیں۔ ہم آج بھی "غیرت" کے نام پر قتل کر دیتے ہیں، ہمیں آج بھی کسی کی پسند ناگوار گزرتی ہے، ہم آج بھی ذاتی فیصلوں پر اجتماعی سزائیں سناتے ہیں۔



غیرت کا مفہوم ہماری معاشرت میں ایک ایسی شکل اختیار کر چکا ہے جو اکثر ظلم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ عزت کا مطلب اب آزادی دینے سے نہیں، بلکہ آزادی چھین لینے سے لیا جاتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ریاست، معاشرہ، اور اہلِ دانش سب جانتے ہیں کہ یہ رویے ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں، لیکن کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔

ہم ایک عجیب تضاد کا شکار قوم ہیں۔ ایک طرف ہم ترقی، تعلیم اور جدت کی بات کرتے ہیں، دوسری طرف ہر معاملے میں دھونس، دھمکی اور روایت کا سہارا لیتے ہیں۔ ہم قانون کو جرگوں کے حوالے کرتے ہیں، اور انصاف کو طاقتور کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

وجدان نے ٹھیک کہا تھا، شاید اس کے دوستوں کا تاثر اتنا غلط بھی نہیں۔ ہم واقعتاً قبائلی ذہنیت کے اسیر ہیں، اور صرف نعروں سے خود کو مہذب ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو، اپنی عورتوں کو، اپنی اقلیتوں کو، ان کی مرضی، ان کا حق، اور ان کی آزادی دینے کے لیے تیار نہیں۔

یہ وقت ہے آئینہ دیکھنے کا۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے اندر جھانکیں اور سوچیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اگر ہم واقعی ایک بہتر پاکستان چاہتے ہیں، تو ہمیں جرگوں، غیرت کے جھوٹے تصور اور معاشرتی جبر کو ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم محض کتابی باتوں سے خود کو بہلاتے رہیں گے، اور دنیا ہمیں وہی سمجھے گی جو وجدان کے دوست سمجھتے ہیں۔

مون سون بارشوں سے بڑھتے صحت عامہ کے مسائل، 'ہمیں قبل از وقت تیاریوں کی ضرورت ہے'

عائشہ خان

ہر سال مون سون کا موسم باقاعدگی سے آتا ہے، اس لیے یہ بارشیں غیر متوقع نہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگ اکثر اس موسم میں آنے والے صحت عامہ کے مسائل کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

مون سون کے صحت عامہ کے خطرات میں اسہال اور ہیضہ سب سے نمایاں ہیں جو خاص طور پر سندھ اور جنوبی پنجاب میں اس موسم میں ان مقامات پر عام ہوجاتا ہے جہاں پینے کے پانی کو سیلاب آلودہ کرتا ہے۔ کراچی، لاہور اور پشاور جیسے شہری نشیبی علاقوں میں کھڑے پانی اور ناقص نکاسی آب کی وجہ سے ڈینگی اور ملیریا کی وبا میں تیزی آتی ہے۔ بے گھر آبادی میں جلد کے انفیکشنز، خارش اور لیپٹوسپائرؤسس سامنے آتے ہیں، زچہ و بچہ کی صحت کے بحران پیدا ہوتے ہیں جبکہ دوردراز سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں معمول کی خدمات نہیں پہنچ پاتیں۔

محکمہ موسمیات مون سون اور اس کی شدت کے بارے میں بار بار ایڈوائزری جاری کرتا ہے لیکن قومی سطح پر ردعمل کی ترجیحات مختلف ہیں۔ اصولی طور پر این ڈی ایم اے وزارت قومی صحت کی خدمات اور صوبائی محکمہ صحت کے ساتھ سیلاب کی صورت حال سے پہلے مل کر ذخیرہ اندوزی کے لیے کام کرتا ہے (جیسے مثال کے طور پر، ہیضہ اور ملیریا سے بچنے والی کٹس جمع کرتا ہے)۔

لیکن پاکستان میں درحقیقت آفات کے بعد کارروائی کی جاتی ہے، پہلے نہیں۔ مثال کے طور پر 2022ء کے سیلاب کے دوران بیماریاں پھیلنے کے کے بعد ہی مدد پہنچ سکی۔ بیماریاں پھیلنے سے پہلے روک تھام کے لیے کسی نے فوری کارروائی نہیں کی۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں ہنگامی حالات کے لیے ایک مرکز موجود ہے جو بیماریوں کا پتا لگاتا ہے لیکن عام طور پر زمینی کارروائی کرنے والے لوگوں کے ساتھ مقامی صحت کے خطرے کی معلومات کا وقت پر اشتراک نہیں کیا جاتا ہے۔ نیز صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (پی ڈی ایم اے) اپنے مون سون منصوبوں میں صحت کے خطرے کا معیاری خاکہ نہیں بنا پاتی اور متوقع خطرات کی بنیاد پر صحت کی فراہمی وقت سے پہلے نہیں بھیجی جاتی۔

پاکستان میں محرکات پر مبنی ابتدائی صحت کے اقدامات زیادہ تر پاکستان ہلالِ احمر سوسائٹی کے سیلاب کے منصوبوں تک محدود ہیں جو صاف پانی، حفظان صحت اور نقد امداد پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ابھی تک کوئی بھی ہیلتھ کٹس ممکنہ متاثرہ علاقوں میں نہیں بھیجی گئی ہیں۔ اس کے برعکس بنگلہ دیش کے پاس صحت، پانی، اور نقدی وسائل جیسے بہت سے شعبہ جات کے لیے ابتدائی ایکشن پلانز موجود ہیں جو سیلاب کی پیش گوئی کے بعد فعال ہوجاتے ہیں۔

نیپال سیلاب اور خوراک کے مسائل کے لیے صحت کے ابتدائی ردعمل پر کام کررہا ہے۔ جب پیش گوئیوں پر مبنی وسائل کے استعمال کی بات آتی ہے تو پاکستان بنیادی طور پر ہلال احمر کے ساتھ ہیٹ ویوز، خشک سالی اور سیلاب کے لیے چھوٹے پائلٹ پروجیکٹس پر کام کررہا ہے۔ بنگلہ دیش نے اس نظام کو قومی سطح پر باضابطہ بنادیا ہے جہاں وسائل کی فراہمی کا منظور شدہ اور واضح منصوبہ موجود ہے۔ نیپال میں تباہی کے خطرے کو کم کرنے کے لیے فعال منصوبے ہیں جو اکثر خوراک کی حفاظت سے منسلک ہوتے ہیں۔

پاکستان میں، مقامی صحت کے پروگرام اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ آپس میں تعاون نہیں کرتے۔ نیپال نے پیش گوئی پر مبنی فنانسنگ ٹاسک فورس کے ذریعے کمیونٹی کلینک کو ابتدائی ایکشن پلان میں شامل کیا ہے۔

حکومت اب بھی صحت کے مسائل کے لیے ابتدائی منصوبہ بندی کی مکمل حمایت نہیں کرتی اور مختلف محکمے الگ الگ کام کرتے ہیں۔ این ڈی ایم اے مون سون کی منصوبہ بندی کی قیادت کرتا ہے لیکن یہ صحت کے منصوبوں سے منسلک نہیں ہے۔ اس کے برعکس بنگلہ دیش نے اپنی ڈیزاسٹر مینجمنٹ منسٹری کے ذریعے 2019ء میں ابتدائی ایکشن پلان شروع کیا جس میں صحت اور دیگر شعبوں کو شامل کیا گیا۔ نیپال قومی پروگرامز اور عطیہ دہندگان کی مدد کے ذریعے آفات اور آب وہوا کی منصوبہ بندی میں صحت کو سرکاری طور پر شامل کرنے پر بھی کام کررہا ہے۔

جبکہ بنگلہ دیش نے پیشگی صحت کی کارروائی کو ادارہ جاتی بنایا ہے خاص طور پر طوفان اور سیلاب سے متاثرہ اضلاع میں اسے قومی صحت کی سپلائی چینز اور پیش گوئی پر مبنی محرکات سے جوڑتے ہوئے، پاکستان تباہی کے بعد اضافے کی نوعیت پر انحصار کرتا ہے جس میں صوبائی سطح پر صحت کے لیے کوئی پیشگی باقاعدہ فعال نظام موجود نہیں ہے۔ صوبائی ڈیزاسٹر سسٹم میں کچھ چیلنجز ہیں۔

ناقص حکمرانی: زیادہ تر صوبوں میں، صحت اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ کے محکمے خطرات یا طبی سامان کے بارے میں تازہ ترین معلومات کا اشتراک نہیں کرتے ہیں۔ کوئی ایک نظام نہیں ہے جیسے ڈیجیٹل ڈیش بورڈ یا نقشہ جو سیلاب کی پیش گوئی کو صحت کی سہولیات کے ان مقامات سے منسلک کرتا ہو جنہیں خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔

کمزور ادارہ جاتی مینڈیٹ: پی ڈی ایم اے کے منصوبے جیسے مون سون کی تیاری کی دستاویزات، بیماریوں کے خطرات کے بارے میں بات کرتی ہیں لیکن واضح طور پر یہ نہیں بتاتے کہ ضلعی صحت کے افسران یا لاجسٹک عملے کو تیاری کے لیے پہلے سے کیا کرنا چاہیے۔

آپریشنل صلاحیت میں فرق: بلوچستان اور خیبر پختونخوا جیسے صوبوں میں سیلاب زدہ علاقوں جیسے ڈیرہ اللہ یار اور ڈی آئی خان کے پاس ادویات یا موبائل ہیلتھ یونٹس کے لیے کولڈ اسٹوریج موجود نہیں ہے جو سیلاب کی وارننگ پر وقت سے پہلے امداد بھیجے یا جنہیں وقت پر استعمال کیا جاسکے۔

مالیات اور خریداری میں تاخیر: یہاں تک کہ جب 7 سے 10 دن کی پہلے ہی ابتدائی وارننگ ہوتی ہے، حکومت کی سطح پر سست منظوریوں اور خریداری کے عمل کی وجہ سے ہنگامی صحت فنڈز اکثر وقت پر جاری نہیں ہوپاتے ہیں۔

غیر سرکاری گروپوں کے ساتھ تعاون کا فقدان: بین الاقوامی این جی اوز اور اقوام متحدہ کی ایجنسیز بعض اوقات اپنے طور پر ابتدائی وارننگ کے منصوبے چلاتی ہیں لیکن یہ حکومتی منصوبوں سے منسلک نہیں ہیں۔ یہ منصوبہ بندی اور لاجسٹکس میں تواتر اور الجھن کا سبب بنتا ہے۔

اگرچہ بہت سے مسائل برقرار ہیں لیکن پاکستان صحت اور آفات سے نمٹنے کی تیاریوں کو آپس میں جوڑنے میں کچھ پیش رفت کررہا ہے۔ 2023ء میں این ڈی ایم اے نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اور مقامی گروپس کے ساتھ مون سون کی ایک مشترکہ مہم چلائی جو کہ مل کر کام کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔

ملک کے قومی موافقت کے منصوبے میں اب آب وہوا سے متعلق بیماریوں کی نگرانی اور گرمی سے متعلقہ صحت کے مسائل سے نمٹنے کے منصوبے شامل ہیں جو موسمیاتی تبدیلی سے صحت کے خطرات کے بارے میں مزید آگاہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ عطیہ دہندگان کے تعاون سے چلنے والے پروگرام جیسے عالمی ادارہ صحت اور ارلی وارننگ الرٹ اور رسپانس نیٹ ورک، سیلاب کے بعد بیماریوں سے باخبر رہنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں آہستہ آہستہ بہتر ہورہے ہیں۔

لیکن یہ پیش رفت اب بھی سست ہے اور صرف علیحدہ منصوبوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ صوبوں کے مضبوط تعاون، شعبوں کے درمیان بہتر ٹیم ورک اور مستحکم مقامی فنڈنگ کے بغیر، صحت کی ابتدائی منصوبہ بندی معمول بننے کی بجائے نادر ہی رہے گی۔ بڑھتے ہوئے درجہ حرارت، طاقتور مون سون اور بیماریوں کے بدلتے ہوئے نمونوں کی وجہ سے موسمیاتی تبدیلی مستقبل کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک صحت کی ہنگامی صورت حال ہے جس سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں۔

پاکستان کو قدرتی آفات کے منصوبوں میں صحت کی پیشگی کارروائیوں کو بھی باضابطہ طور پر شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ ان کوششوں کو صرف عطیہ دہندگان پر انحصار کرنے کے بجائے صحت کے بجٹ سے رقم فراہم کی جائے۔ اور ایسے نظام بنائیں جو ریئل ٹائم ڈیٹا، ابتدائی انتباہات اور مختلف شعبوں میں ٹیم ورک کو بروئے کار لاسکے۔

پاکستان کو ایک 'ماحولیاتی اور صحت سے متعلقہ لچکدار پالیسی' کی ضرورت ہے جو مختلف اداروں کو آپس میں منسلک کرتی ہو، موسمیاتی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے صحت کے مسائل کی پیش گوئی کرتی ہو اور وبا کے پھیلنے سے پہلے اقدامات کرنے میں مدد کرتی ہو۔

(بشکریہ روزنامہ ڈان)

قبائلی تنازعات کے خاتمے میں مثبت کردار ادا کرنے والوں کو سراہا جائے

نوشکی بلوچستان کی پستی اور پسماندگی کی ایک بڑی وجہ قبائلی تنازعات ہے جس کی وجہ سے بلوچستان کے عوام 21 ویں صدی میں بھی پستی اور پسماندگی سے دوچار ہے۔ بلوچستان کے قبائلی تنازعات کے خاتمے کے تمام قبائلی عمائدین علماء اکرام سعادت برادری اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں اپنا مثبت کردار کرنا ہوگا۔ بلوچستان کے بلوچ پشتون اپنے قبائلی تنازعات کو باہمی رواداری بلوچ پشتون روایات اور اسلامی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے قبائلی تنازعات کا خاتمے کرکے بلوچستان کو امن کا گہوارہ اور پھولوں کا گلدستہ بنا کر آنے والی نسل کو روشن اور خوشحال مستقبل دے سکتے ہیں۔ نوشکی ڈسٹرکٹ میں نامور ایڈوکیٹ میر عاقل خان بادینی، مولانا حافظ فرید احمد مینگل اور غلام حیدر سمالانی نے جس خلوص اور جذبہ خیر سگالی سے نوشکی میں دیرینہ قبائلی تنازعات بلخصوص جمالدینی قوم کے دو ذیلی طائفون کے مابین خونی تنازعہ کا تصفیہ کرکے نئی مثال قائم کردی، اگر اسی جذبے اور عزم کے ساتھ بلوچستان کے بلوچ پشتون قبائیلی زلما اسی جذبہ اور عزم سے قبائلی تنازعات کے خاتمے کا عزم کریں تو قبائلی تنازعات میں سلگتا بلوچستان امن کا گہوارہ اور پھولوں کا گلدستہ بن سکتا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی رہنماؤں کو نوشکی کے قبائلی تنازعات کے خاتمے کے لیے نوشکی کے فرزند ایڈوکیٹ میر عاقل خان بادینی، مولانا حافظ فرید احمد مینگل اور غلام حیدر سمالانی کی تقلید کرنا ہوگی۔ نوشکی کی سرزمین جہاں ایک طرف تاریخ، ثقافت، قبائلی وقار اور غیرت کا مرکز رہی ہے، وہیں دوسری طرف خونی تنازعات، قبائلی رنجشیں، اور خاندانی دشمنیاں بھی اس کی پہچان کا حصہ رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں امن کی بات کرنا، بگڑتے ہوئے معاملات میں کودنا، اور اپنی عزت، وقت اور توانائی داؤ پر لگا کر فریقین کو صلح کے میز پر بٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ کردار وہی ادا کرسکتا ہے جو واقعی امن کا پیامبر ہو، اور نوشکی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ایسے کردار موجود ہیں۔ ایڈوکیٹ میر عاقل خان بادینی، حافظ فرید احمد مینگل اور غلام حیدر سمالانی کا شمار انہی خاموش، مگر مؤثر سپاہیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات، بلوچی رسم و رواج اور انسان دوستی کو بنیاد بنا کر درجنوں خونی رنجشوں کا خاتمہ کیا ہے۔ ان شخصیات کا طریقہ کار نہ شور کرتا ہے، نہ اشتہار مانگتا ہے، بلکہ خاموشی سے معاشرے کو جوڑنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ حال ہی میں جمالدینی قبیلے کے مابین سالوں پر مبنی خونی دشمنی کا جو تصفیہ ہوا، وہ ان تینوں شخصیات کی حکمت، سچائی اور مسلسل کوششوں کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ مینگل وساسولی قبیلہ، مینگل وابا بکی، کیشنگی میں مینگل قبیلے کے دو برادریوں کے مابین خونی رنجشوں کا خاتمہ بھی انہی شخصیات کے کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف بلوچی میڑھ لے جا کر صلح کی بنیاد رکھی بلکہ وہ عزت حاصل کی جسے نہ وقت مٹا سکتا ہے اور نہ کوئی جھٹلانے کی جسارت کرسکتا ہے۔ ان تینوں شخصیات نے جو کردار ادا کیا، وہ وقتی یا نمائشی نہیں بلکہ پائیدار اور دیرپا امن کا پیغام ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ صلح محض دو ہاتھ ملانے کا نام نہیں، بلکہ دلوں کے فاصلے ختم کرنے کا عمل ہے۔ اور یہی انہوں نے کیا۔ آج نوشکی کو ان کی شکل میں ایسے خیر خواہ میسر ہیں جو قبائل، خاندانوں اور برادریوں کو دشمنی سے نکال کر بھائی چارے میں بدل دیتے ہیں۔ ان کی خدمات نہ صرف قابل ستائش ہیں بلکہ نئی نسل کے لیے مثال بھی ہیں۔ میری رائے میں اب وقت آ چکا ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کو دستاویزی شکل دی جائے، انہیں سراہا جائے، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، تاکہ ان کے نقش قدم پر مزید لوگ آگے بڑھیں۔ کیونکہ امن صرف حکومتوں کی پالیسیوں سے نہیں، بلکہ انہی مخلص انسانوں کی کاوشوں سے ممکن ہوتا ہے جو کسی صلے یا شہرت کی تمنا کے بغیر معاشرے کو جوڑتے ہیں۔ ہم ان "امن کے پیامبروں" کو سلام پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو شرفِ قبولیت دے، اور نوشکی ہمیشہ ان کی کاوشوں کی روشنی میں امن کا گہوارہ بنا رہے۔

(محمد سعید)

15 ہاری بازیاب

عمرکوٹ کنری پولیس نے سیشن کورٹ عمرکوٹ کے حکم پر چیل بند کے قریب زمیندار نور خان رند کی زرعی زمین پر چھاپہ مار کر جبری مشقت کے شکار بھیل قبیلے کے 15 ہاری افراد میش، پرکاش، سوناری، دھنی، کیول اور دیگر کو ہیرو بھیل کی طرف سے اہل خانہ کی مبینہ قید سے بازیابی کے لئے دی گئی درخواست پر بازیاب کرالیا۔ مذکورہ ہاریوں نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ ایک سال سے بطور ہاری کام کررہے ہیں۔ زمیندار کوئی اجرت نہیں دیتا تھا۔ ظلم بھی کیا جاتا تھا۔ زمیندار نے الٹا ہم پر قرضہ نکالا ہے۔ عدالت نے تمام ہاریوں کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق آزاد زندگی گزارنے کی اجازت دے دی۔

(نامہ نگار)

3 قتل کے بدلے 6 قتل

شہید بے نظیر آباد 17 جولائی 2025 کی علی الصبح 15 سال قبل ہونے والے 3 قتل کے مقدمے میں پیشی کیلیے عدالت جانے والے 6 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تھانہ بی سیکشن پولیس نواب شاہ کی حد میں واقع کیریاموری کے مقام پر کچے راستے پر موٹر سائیکلوں پر سوار 6 افراد کو گولیاں ماردی گئیں اور ملزمان موقعہ سے فرار ہوگئے۔ واقعہ کی اطلاع پر پولیس نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر مقتولین کی نعشیں ضابطے کی کارروائی کیلیے پیپلز میڈیکل ہسپتال منتقل کردیں۔ واقعہ میں ہلاک ہونے والوں کا تعلق بھنگوار برادری سے ہے جن کا 15 سال قبل زرعی پانی کے تنازعے پر اپنی ہی برادری کے مخالف گروہ سے جھگڑا ہوا تھا جس کے نتیجے میں مخالف گروہ کے تین افراد قتل ہوئے تھے۔ 2010 میں ہونے والے تین قتل کا کیس عدالت میں زیر سماعت مگر التواء کا شکار بنا رہا جس کی بناء پر 17 جولائی 2025 کو تین مقتولین کے رشتہ داروں نے خون کا بدلہ خون کے مصداق مخالف فریقین کے 6 افراد کو عدالت جاتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ زرعی پانی کی وارہ بندی کے تنازعہ پر بھنگوار برادری کے دونوں فریقین اب تک 9 افراد کی زندگی کا دیا بجھا چکے ہیں جس سے قانون کی رٹ متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔ ادھر تازہ 6 افراد کے قتل کے ملزم فرار ہیں تاہم پولیس نے قاتموں کی گرفتاری کیلیے ان کے گھروں پر چڑھائی کرکے ہیوی مشینری سے گھروں کو مسمار کرکے آگ لگادی جبکہ قیمتی ساز و سامان ضبط کرلیا۔ 6 افراد کی لرزہ خیز قتل کی واردات کا شکار ہونے والوں میں تاج محمد بھنگوار، غلام محمد بھنگوار، نثار علی بھنگوار، شہباز علی بھنگوار، قربان علی اور حیدر علی بھنگوار شامل ہیں جنکا تعلق بھنگوار برادری سے ہی ہے۔ نعشوں کے پوسٹ مارٹم کے بعد میتیں ورثاء کے حوالے کردی گئی ہیں جنکی آبائی قبرستان میں تدفین کردی گئی ہے۔ اطلاعات ہیں کہ پولیس نے مختلف مقامات پر چھاپے مار کر سات افراد کو حراست میں لے لیا جن سے تفتیش جاری ہے۔ ایس ایس پی شہید بینظیر آباد نے فوری نوٹس لیتے ہوئے واقعے میں ملوث ملزمان کے گرفتاری کے لیے 3 ٹیمز تشکیل دی گئی ہے جو کہ ملزمان کی گرفتاری کے لئے ممکنہ ٹھکانوں پر چھاپے ماررہی ہیں ایس ایس پی نے واضح کیا ہے کہ کسی بھی صورت میں ملزمان کو قانون کی گرفت میں لایا جائے گا اور انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں گے۔ بہیمانہ قتل کا وقعہ پوری منصوبہ بندی سے کیا گیا۔ واقعے سے قبل ہی ملزمان اپنا سارا سامان واہل خانہ کو پہلے ہی کسی محفوظ مقام پر منتقل کرچکے تھے۔

(آصف البشر)

نقل مکانی کے خلاف مزاحمت کا فیصلہ

خیبر باڑہ سیاسی اتحاد کی پشاور پریس کلب میں اہم پریس کانفرنس۔ تیراہ میدان سے انخلاء کے خلاف واضح مؤقف۔ پشاور پریس کلب میں باڑہ سیاسی اتحاد کے زیرِ اہتمام ایک نہایت اہم پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت باڑہ سیاسی اتحاد کے صدر ہاشم خان آفریدی نے کی۔ اس پریس کانفرنس میں تحصیل کونسل باڑہ کی کور کمیٹی کے 14 ارکان نے خصوصی شرکت کی، جو کہ باڑہ کی عوامی نمائندگی اور اتحاد کا مظہر ہے۔ پریس کانفرنس میں یہ مؤقف بڑے واضح انداز میں اپنایا گیا کہ تیراہ میدان سے نقل مکانی کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ رہنماؤں نے کہا کہ تیراہ میدان پہلے ہی کئی بار آپریشنز کا نشانہ بن چکا ہے اور ان تمام کارروائیوں کے باوجود مسائل کا مستقل حل نہیں نکالا گیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ بار بار کے آپریشنز کی بجائے قبائلی علاقوں میں پائیدار امن، ترقی، روزگار اور تعلیم کے مواقع فراہم کرے تاکہ قبائلی عوام کا اعتماد بحال ہو۔ پریس کانفرنس میں باڑہ سیاسی اتحاد کے سابق صدور شاہ فیصل آفریدی اور حاجی شیرین آفریدی نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ حکومت نے فاٹا انضمام کے وقت جو وعدے قبائلی عوام سے کیے تھے وہ وعدے آج بھی تشنہ تعبیر ہیں۔ انہوں نے زور دیا کہ ان وعدوں پر جلد از جلد عملدرآمد کیا جائے تاکہ قبائل احساس محرومی سے باہر نکل سکیں۔ تحصیل کونسل باڑہ کے نمائندوں نے اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا کہ باڑہ سیاسی اتحاد اور عوامی نمائندے اپنے لوگوں کے مفادات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ یہ اتحاد نہ صرف عوامی آواز ہے بلکہ قبائلی وقار، زمین اور شناخت کی حفاظت کا نشان بھی ہے۔ باڑہ سیاسی اتحاد اور تحصیل کونسل باڑہ نے حکومتِ وقت سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر تیراہ میدان میں نکال مقانی کی پالیسی واپس لے اور قبائلی علاقوں میں امن و ترقی کو ترجیح دے۔ رہنماؤں نے یہ بھی باور کروایا کہ باڑہ کے عوام پرامن ہیں، اور ہر فیصلے میں اُن کی مشاورت اور رضامندی ضروری ہے۔

(منظور آفریدی)

جرائم کی روک تھام اور قانون

------ بہت سے ممالک کی جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی بھرے ہیں جنہیں طبی سہولیات، صاف پانی اور صحت وصفائی کے انتظام جیسے بنیادی حقوق حاصل نہیں۔ اقوام متحدہ نے تمام حکومتوں پر زور دیا ہے کہ وہ قیدیوں کے حالات میں بہتری لانے کے لیے نظام انصاف میں ضروری اصلاحات کو یقینی بنائیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے آج اس مسئلے پر ایک اجلاس کا انعقاد کیا جس میں معاشروں کو جرائم سے بہتر تحفظ فراہم کرنے کے لیے مجرموں کو قید کے بعد زندگی کی بحالی میں مدد دینے کے طریقوں پر بات چیت کی گئی۔ ایک دہائی قبل اسمبلی نے 'نیلسن منڈیلا ضوابط' کی منظوری دی تھی جو 122 رہنما ہدایات کا مجموعہ ہے۔ اس میں قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے حوالے سے کم از کم ضابطے متعین کیے گئے ہیں۔ یہ اقدام دنیا کے باانثر ترین سابق قیدی اور جنوبی افریقہ میں شہری حقوق کے لیے کام کرنے والی نمایاں ترین شخصیت اور ملک کے سابق صدر نیلسن منڈیلا کی زندگی اور جدوجہد سے تحریک پاکر شروع کیا گیا۔ ان ضوابط کا مقصد قیدیوں کے تحفظ، سلامتی اور انسانی وقار کو یقینی بنانا اور قید خانوں کے عملے کے لیے واضح قوانین اور اصول پیش کرنا ہے۔

حقوق سے محرومی

اقوام متحدہ کے دفتر برائے انسداد منشیات و جرائم (یواین او ڈی سی) کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر غادہ ولی نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دنیا بھر میں قیدیوں کی تعداد ایک کروڑ 15 لاکھ ہے۔ جب جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی رکھے جاتے ہیں تو وہ اپنے بہت سے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں نا صرف انہیں اور جیل کے عملے کو خطرات لاحق ہوتے ہیں بلکہ سزا کاٹنے کے بعد ان قیدیوں کو معاشرے کا کارآمد شہری بنانے کی کوششوں کو بھی نقصان ہوتا ہے اور اس سے پورے سماج پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

خواتین قیدیوں کے لیے خطرات

گزشتہ 20 برس کے دوران دنیا بھر کی جیلوں میں خواتین قیدیوں کی تعداد 57 فیصد بڑھ گئی ہے جو مردوں کے مقابلے میں تقریباً تین گنا بڑی شرح ہے۔ غادہ ولی نے کہا کہ بیشتر ممالک میں جیلوں کا نظام ان قیدیوں کی مخصوص ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ یہ نہ تو محفوظ صورتحال ہے اور نہ ہی یہ انسانی حالات کہے جاسکتے ہیں۔ حراستی مراکز میں خواتین کو جنسی تشدد، تولیدی صحت کی سہولیات تک محدود رسائی اور اپنے بچوں سے علیحدگی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غیر معمولی اصلاحات کی ضرورت

غادہ ولی نے کہا کہ صورتحال میں اصلاح کے لیے محض جیل کی دیواروں اور سلاخوں کے بجائے لوگوں اور ان کے امکانات پر توجہ دینا ہوگی۔ حکومتوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ قیدیوں کے حالات کیسے بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر ذمہ دارانہ طور سے کام کیا جائے تو جیلیں عوام کے تحفظ، انصاف اور قانون کی عملداری میں مدد دے سکتی ہیں۔ لیکن دور حاضر میں جیلوں کا ماحول عموماً خطرناک اور غیر مفید ہوتا ہے۔ اجلاس میں اقوام متحدہ کے حکام نے واضح کیا کہ جیلوں کے حوالے سے اصلاحاتی کام میں قیدیوں کی بحالی کو مرکزی اہمیت دینا ہوگی اور ایسے نظام وضع کرنا ہوں گے کہ قیدی سزا مکمل کرنے کے بعد دوبارہ جرائم کی زندگی کی طرف جانے کے بجائے معاشرے کے کارآمد رکن ثابت ہوں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر فائلیمن یانگ نے اجلاس سے اختتامی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اصل انصاف یہ نہیں کہ کسی کو سزا کیسے دی جاسکتی ہے بلکہ قیدیوں کا تحفظ، انکی بحالی اور ہر جگہ ہر ایک کے لیے بہتر مستقبل کی تعمیر ہی حقیقی انصاف ہے۔

(بشکریہ یواین خبرنامہ)

افراد باہم معذوری کا احتجاج

خیبر باڑہ خیبر چوک کو ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا ہے، جہاں افراد باہم معذوری نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے احتجاج کیا۔ مظاہرین کا کہنا ہے کہ وہ کئی سالوں سے بنیادی حقوق سرکاری امداد روزگار کے مواقع اور فلاحی اسکیموں سے محروم ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ حکومت انہیں باعزت زندگی گزارنے کے لیے فوری اقدامات کرے، جن میں خصوصی کوٹے پر روزگار مالی امداد اور معیاری صحت و تعلیم کی سہولیات شامل ہیں۔ مظاہرین نے واضح کیا ہے کہ جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے دھرنا جاری رہے گا۔ ٹریفک کی بندش کے باعث شہریوں کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ اور قریبی علاقوں میں ٹریفک جام کی صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔ انتظامیہ اور متعلقہ حکام تاحال مظاہرین سے مذاکرات کے لیے نہیں پہنچے۔ عوامی حلقوں نے بھی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ معذور افراد کے جائز مطالبات فوری طور پر تسلیم کیے جائیں تاکہ سڑک کھولی جاسکے اور شہری معمول کے مطابق نقل و حرکت کر سکیں۔

(مسعود شاہ)

عورتیں

لڑکی سے مبینہ اجتماعی زیادتی

قصور واقعہ کی ایف آئی آرلڑکی کے والد عبدالجبار کی مدعیت میں تھانہ کوٹ رادھاکشن میں درج کرلی گئی ہے، جس میں مرکزی ملزم ذیشان کو نامزد کیا گیا ہے، جبکہ دو دیگر ملزمان تاحال نامعلوم ہیں۔ضلع قصور کی تحصیل کوٹ رادھاکشن کے تحصیل ہیڈکوارٹر ہسپتال میں 16 سالہ لڑکی کے ساتھ مبینہ طور پر ہسپتال کے وارڈ بوائے اور اس کے دو نامعلوم ساتھیوں نے اجتماعی زیادتی کی۔ واقعہ کی ایف آئی آرلڑکی کے والد عبدالجبار کی مدعیت میں تھانہ کوٹ رادھاکشن میں درج کرلی گئی ہے، جس میں مرکزی ملزم ذیشان کو نامزد کیا گیا ہے، جبکہ دو دیگر ملزمان تاحال نامعلوم ہیں۔ایف آئی آر کے متن کے مطابق، متاثرہ لڑکی کا کزن محمد عمر گزشتہ چار روز سے سول ہسپتال کوٹ رادھاکشن میں زیرعلاج تھا، جہاں اسے روزانہ آکسیجن دی جاتی تھی۔ 13 جولائی کی رات دس بجے متاثرہ لڑکی اپنی چچی کے ہمراہ ہسپتال گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واش روم کے لیے باہر نکلی تو اسے وارڈ بوائے ذیشان ملا، جس سے اس نے بچہ وارڈ کا راستہ پوچھا۔ ذیشان نے اسے بچہ وارڈ لے جانے کے بہانے ہسپتال کی تیسری منزل پر واقع ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ایف آئی آر میں الزام لگایا گیا ہے کہ متاثرہ لڑکی نے شور مچانے کی کوشش کی تو ملزم نے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور کمرے میں موجود تاروں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ بعد ازاں، ذیشان نے اپنے دو نامعلوم ساتھیوں کو فون پر بلایا، جو موقع پر پہنچے اور تینوں نے مبینہ طور پر لڑکی کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ پولیس کو واقعے کی اطلاع 15 پر کال کے ذریعے ملی، جس پر فوری کارروائی کرتے ہوئے پولیس ٹیم موقع پر پہنچی۔ تفتیشی افسر آصف اقبال کے مطابق، ہسپتال کی تیسری منزل پر ایک کمرہ بند پایا گیا جس کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ پولیس کو دیکھ کر مرکزی ملزم ذیشان نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی، جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اسے شدید زخمی حالت میں لاہور کے جنرل ہسپتال منتقل کیا گیا۔لیس نے مقدمے میں پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 375-اے کے تحت اجتماعی زیادتی کا مقدمہ درج کیا ہے، اور واقعے کی تفتیش جاری ہے۔ دوسری جانب، سول ہسپتال کوٹ رادھاکشن کی انتظامیہ نے بھی واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے تین رکنی انکوائری کمیٹی تشکیل دے دی ہے، جس میں سینئر ڈاکٹرز شامل ہیں۔ کمیٹی کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ واقعے کی مکمل تحقیقات کرے اور رپورٹ جلد از جلد پیش کرے۔

(اعتزاز ابراہیم)(بشکریہ وائس پی کے)

کھیلوں میں صنفی تفریق کا خاتمہ ضروری، انسانی حقوق چیف



پاکستان میں یواین ویمن کی مدد سے کام کرنے والا لڑکیوں کے لیے ہاکی کا ایک تربیتی مرکز

------ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق وولکر ترک نے رکن ممالک اور دنیا بھر میں تمام کھیلوں کی ٹیموں پر زور دیا ہے کہ وہ اس شعبے میں بڑے پیمانے پر پائی جانے والی صنفی تفریق کا خاتمہ کریں جہاں اب بھی سبھی کو مساوی مواقع میسر نہیں ہیں۔سوئزرلینڈ میں جاری یوروفٹ بال چیمپئن شپ کے موقع پر بات کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ چند سال کے دوران خواتین کے کھیلوں کے مقابلوں نے نمایاں توجہ حاصل کی ہے اور 2023 میں خواتین کا فٹ بال ورلڈ کپ تقریباً ایک ارب لوگوں نے دیکھا۔اس توجہ کی بدولت دقیانوسی تصورات اور خواتین کے کھیلوں میں طاقت اور اختیار کی حرکیات کے حوالے سے اہم بات چیت شروع ہوئی ہے۔ ہائی کمشنر نے کہا ہے کہ خواتین کے کھیلوں کی دنیا میں بہت سے گروہوں کو رکاوٹوں اور تفریق کا سامنا ہے۔ایل جی بی ٹی کیو آئی+خواتین، سر پر سکارف اوڑھنے والی، جسمانی معذور اور پسماندہ قومی و نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والی خواتین اور لڑکیوں کے لیے یہ مسائل اور بھی زیادہ ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ کھیلوں کی ایسی دنیا تعمیر کرنے کی ضرورت ہے جس میں خواتین اور لڑکیوں کی ان کے تمام تر تنوع کے ساتھ مساوی طور پر قدر کی جائے اور انہیں بہتر توجہ اور معاوضہ ملے۔

اجرتوں میں فرق

اگرچہ فٹ بال کے پیشہ ور مرد کھلاڑی بڑی ٹیموں/کلبوں میں سالانہ 1.8 ملین ڈالر کماتے ہیں لیکن ایسی ہی ٹیموں میں کھیلنے والی خواتین کھلاڑیوں کی سالانہ اوسط آمدنی تقریباً 24 ہزار ڈالر تک ہوتی ہے۔ چھوٹی ٹیموں میں کھیلنے والی خواتین کھلاڑی اس سے بھی کم آمدنی پاتی ہیں جو اوسطاً 10,900 ڈالر تک ہے۔ وولکر ترک نے کہا ہے کہ مستحکم آمدنی کے بغیر خواتین دیگر کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جس کے باعث انہیں تربیت اور اپنے کھیل میں بہتری کے لیے کہیں کم وقت اور توانائی دستیاب ہوتی ہے۔ روزگار میں مناسب تحفظ کی کمی کے باعث معاوضوں کا فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔خواتین کو زچگی میں بہت کم چھٹیاں ملتی ہیں اور جب انہیں ہراسانی کا سامنا ہو تو ان کے لیے تحفظ اور ازالے کا حصول آسان نہیں ہوتا۔ پیشہ وارانہ کھیلوں کے کلبوں اور تنظیموں میں قائدانہ عہدوں پر خواتین کی نمائندگی بھی بہت کم ہے۔ دنیا بھر میں کھیلوں کی 31 تنظیموں میں سے صرف تین کی سربراہ خواتین ہیں۔ تاہم، اب بعض تنظیموں نے اپنے ہاں تبدیلی کا عمل شروع کر رکھا ہے جو خواتین کھلاڑیوں کو زچگی کی چھٹیاں دے رہی ہیں اور انہیں بہتر معاوضوں کی فراہمی کے لیے بھی کام کر رہی ہیں۔

سماجی تبدیلی کی ضرورت

وولکر ترک نے رکن ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ کھیلوں کے شعبے میں تفریق کا خاتمہ کرنے کے جامع نظام قائم کریں اور انہیں مردوں کے مساوی معاوضوں کی ادائیگی اور ہراسانی کی صورت میں انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ خواتین کے کھیلوں کی درست اور اخلاقی اصولوں کیمطابق کوریج کر کے اچھائی کی قوت بن سکتے ہیں۔ کھیل سماجی تبدیلی لاتے ہیں اور ان سے تمام لوگوں کے لیے شفافیت، احترام اور مساوی مواقع کو یقینی بنانے میں مدد ملتی ہے۔ سبھی کو کھیلوں کی ایسی دنیا کی حمایت کرنا ہوگی جہاں خواتین اور لڑکیاں ترقی کر سکیں۔

(بشکریہ یواین خبرنامہ)

جنوبی ایشیا: خون کی کمی سے خواتین کی صحت اور معاشی مستقبل کو خطرہ

جسم میں خون کی کمی جنوبی ایشیا میں صحت کا خاموش مگر وسیع بحران ہے جو غریب ترین خواتین اور لڑکیوں کو غیر متناسب طور سے متاثر کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے بتایا ہے کہ ہنگامی طبی اقدامات کے بغیر 2030 تک مزید ایک کروڑ 80 لاکھ خواتین اس کا نشانہ بن جائیں گی۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسف)، عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) اور علاقائی ممالک کی تنظیم سارک کے مطابق، خواتین اور نوجوان لڑکیوں میں خون کی کمی کے اعتبار سے جنوبی ایشیا دنیا میں سرفہرست علاقہ ہے۔ اندازے کے مطابق، خطے میں 259 ملین خواتین اس مسئلے کا شکار ہیں جو آکسیجن لینے کے لیے جسم کی صلاحیت کو نقصان پہنچاتا، شدید تھکن پیدا کرتا، زچگی کے مسائل کا سبب بنتا اور لڑکیوں کے لیے تعلیمی و معاشی مواقع کو محدود کر دیتا ہے۔ یونیسف کے ریجنل ڈائریکٹر سنجے وجے سیکرا نے کہا ہے کہ جنوبی ایشیا میں تمام نوجوان لڑکیوں اور خواتین کی نصف تعداد خون کی کمی کا شکار ہے اور اس طرح یہ محض طبی مسئلہ نہیں بلکہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ طبی نظام لوگوں کی صحت کو تحفظ دینے میں ناکام ہیں۔

قابل انسداد طبی مسئلہ: خون کی کمی محض خواتین اور لڑکیوں کی صحت کو ہی متاثر نہیں کرتی بلکہ دنیا بھر میں 40 فیصد کم وزن بچوں کی پیدائش کا بڑا سبب بھی یہی ہے۔ اس سے بچے کی نشوونما اور سیکھنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے جبکہ غریب گھرانوں کے بچے اس مسئلے سے غیر متناسب طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ خون کی کمی کے نتیجے میں جنوبی ایشیا کو سالانہ 32.5 ارب ڈالر کا نقصان ہوتا ہے جبکہ اس سے غربت اور کمزور صحت کے سلسلے کو بھی دوام ملتا ہے۔ تاہم، خون کی کمی کا علاج ممکن ہے۔ جو لوگ اس مسئلے کا شکار ہوں ان کی صحت کو آئرن اور فولک ایسڈ کے سپلیمنٹ دینے، آئرن اور وٹامن سے بھرپور خوراک کی فراہمی، صحت و صفائی کے بہتر انتظام اور ذہنی صحت کی اچھی خدمات مہیا کر کے بحال کیا جا سکتا ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس ضمن میں پائیدار پیش رفت کے لیے مختلف شعبوں کا باہمی تعاون بہت ضروری ہوتا ہے۔

حوصلہ افزا پیش رفت: تقریباً ہر ملک میں اس حوالے سے پیش رفت کا دارومدار طبی نظام کو مضبوط بنانے، لوگوں کو غذائیت مہیا کرنے کے اقدامات کو وسعت دینے اور غریب طبقات میں نوجوان لڑکیوں اور خواتین تک رسائی پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے انڈیا اور پاکستان میں بھی حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔ انڈیا کے جن علاقوں میں لوگوں کی بڑی تعداد خون کی کمی کا شکار ہے وہاں سکولوں اور زچہ کی نگہداشت کے پروگراموں میں آئرن سپلیمنٹ کی فراہمی کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان نے مقامی سطح پر غذائیت کی فراہمی کے ایسے اقدامات شروع کیے ہیں جو تولیدی صحت کی خدمات سے منسلک ہیں اور ان کی بدولت ابتدائی مرحلے میں ہی خون کی کمی کی نشاندہی اور متاثرہ افراد کو ضروری طبی نگہداشت مہیا کی جاتی ہے۔ سری لنکا میں تولیدی عمر کی 18.5 فیصد خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں جہاں ملکی سطح پر غذائیت کے پروگراموں کو وسعت دی جا رہی ہے اور اس ضمن میں ایسے علاقے حکومتی توجہ کا خاص مرکز ہیں جہاں یہ مسئلہ بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ اسی طرح، بنگلہ دیش نے صحت، تعلیم اور زراعت کی وزارتوں کے اشتراک سے سکولوں میں مقوی کھانے اور طبی تعلیم کی فراہمی کے اقدامات شروع کیے ہیں۔ **کامیابی کی نمایاں مثال:** مالدیپ اور بھوٹان نے چھوٹے بچوں کو غذائیت کی فراہمی کے ذریعے انہیں خون کی کمی کے مسئلے سے پیشگی تحفظ دینے کے ترجیحی اقدامات شروع کیے ہیں۔ اس سلسلے میں عوامی سطح پر آگاہی کی مہمات بھی چلائی جا رہی ہیں۔ نیپال اس حوالے سے کامیابی کی ایک نمایاں مثال ہے جہاں خون کی کمی کا شکار تولیدی عمر کی خواتین کی تعداد میں 2016 کے بعد 7 فیصد کمی آئی ہے۔ اس ضمن میں غریب علاقوں میں طبی مراکز کے قیام اور خواتین طبی رضاکاروں کا اہم کردار ہے۔ ان اقدامات کے تحت حاملہ خواتین کو انڈے، مرغی کا گوشت اور مقوی غذا فراہم کرنے کے علاوہ نقد مدد بھی دی جا رہی ہے۔

مشترکہ اقدامات کی ضرورت: جسم میں خون کی کمی کے مسئلے پر قابو پانا قیادت اور مشترکہ اقدامات کا تقاضا کرتا ہے۔ اس ضمن میں حکومتی سطح پر اقدامات بہت ضروری ہیں لیکن مقامی لوگوں، طبی کارکنوں، سکولوں اور خاندانوں کو بھی آگے آنا ہوگا۔ (بشکریہ یو این خبر نامہ)

اداریہ: 'خواتین خاندان کی غیرت کی حفاظت کرنے والی اشیا نہیں ہیں'

'غیرت کے نام پر قتل' فرسودہ روایات کی پیروی کرنے کے لیے کیا جانے والا ایسا فعل ہے جو خون سے پروان چڑھتا ہے۔ صنفی تشدد کی سب سے گھناؤنی شکل اس وقت دیکھنے میں آتی ہے کہ جب ایک عورت محبت کرنے کی ہمت کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے خاندانی عزت کو پامال کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں متعلقہ عورت اور اس کے ساتھی کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلوچستان کے ضلع جعفر آباد میں گزشتہ ماہ نوجوان جوڑے کو قتل کیے جانے کی ایک دلخراش ویڈیو حال ہی میں سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی ہے اور اس نے پورے پاکستان میں ہلچل مچا دی ہے۔ لرزہ خیز فوٹیج میں ایک نوجوان خاتون کو گولیوں سے قتل ہوتے دیکھا گیا جبکہ کئی مرد کھڑے دیکھتے رہے۔ ریاست کی جانب سے دہشتگردی کا مقدمہ درج کیا گیا ہے اور مبینہ طور پر قتل کا حکم دینے والے قبائلی سربراہ سمیت ایک درجن مشتبہ افراد زیر حراست ہیں۔ مقدمہ سیریس کرائمز انویسٹی گیشن ونگ کو منتقل کر دیا گیا ہے جبکہ کوئٹہ کے جوڈیشل مجسٹریٹ نے خاتون کی قبر کشائی کا حکم دیا۔ دوسری جانب اٹک میں بھی دو مردوں نے خاندان کی 'غیرت' بحال کرنے کے لیے خون بہانے کا سہارا لیا اور نومولود کی ماہ کو اس کے شوہر اور سسر نے 'کردار' کے حوالے سے شکوک و شبہات میں متعدد گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ لوئر دیر میں فرقہ وارانہ غیرت نے ناجائز تعلقات رکھنے کے شبہ میں ایک جوڑے کی جان لے لی۔ ان خوفناک جرائم کے تسلسل نے پاکستان میں متوازی نظام عدل اور خواتین کے حقوق کی کمزوری کی بارے میں غم و غصے کو جنم دیا ہے۔ ان جرائم کو روایت یا ثقافت کے حصے کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے جو انہیں کسی طرح قابل قبول قرار دیتے ہوں۔ 2016ء میں حکومت نے نظام میں موجود ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی کہ جن کے نتیجے میں غیرت کے نام پر قتل کرنے والے کسی سزا کے بغیر آزاد گھومتے تھے۔ پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 311 جو 'فساد فی الارض' پر بات کرتا ہے، یقینی بناتا ہے کہ جب 'غیرت کے نام پر قتل' ہو اور شکایت کنندہ مجرم کو معاف کر دے تو اس صورت میں ریاست کو مداخلت کا اختیار حاصل ہے۔ ان ترامیم کے باوجود قتل بشمول غیرت کے نام پر قتل کی سزا کو مقتولین کے ورثا معاف کر دیتے ہیں۔ عدالتیں شاذ و نادر ہی مجرمان اور لواحقین کے درمیان تصفیہ کو ختم کرنے کے لیے صوابدید کا استعمال کرتی ہیں، اس طرح قاتلوں کو سزا سے استثنیٰ مل جاتا ہے جو کہ اب ایک روایت بن چکا ہے۔ ریاست کو اپنے شہریوں کو پدرشاہی نظام کے کینسر سے بچانے کا عزم ظاہر کرنا چاہیے۔ جنوری 2024ء سے نومبر 2024ء تک انسانی حقوق کمیشن کے اعداد و شمار کے مطابق 'غیرت' کے نام پر 346 افراد مارے گئے۔ گزشتہ دو سالوں میں اس طرح کے قتل کے بڑھتے واقعات کو روکنے کا واحد راستہ ایسی قانونی اصلاحات کی ضرورت ہے جو انصاف، انسانی حقوق اور ذمہ داری کی حمایت کریں۔ سماجی کارکنان کی جانب سے صرف بندوق کی نال کا سامنا کرنے والی خاتون کی جرات کی تعریف کرنا کافی نہیں۔ کسی کو بھی ایسی روایات کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہیے۔ خواتین خاندان کی ساکھ کی حفاظت کرنے والی اشیا نہیں ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ ڈان)

بھابھی کو قتل کر دیا

میانوالی تھانہ موچھ کے نواحی علاقہ دلیوالی میں دیوروں نے بیوہ بھابی کا گلہ دبا کر قتل کر دیا۔مقتولہ کا شوہر رواں سال کے شروع میں قلات میں شہید ہوا تھا۔مقتولہ کے بھائی کی مدعیت میں تین ملزمان کے خلاف ایف ائی آر درج ہوگئی ہے وجہ تنازعہ بیوہ کو ملنے والی ادراہ کی طرف سے (حق حقوق کی رقوم) بیان کی جارہی ہے۔یہ رقم دیور لینا چاہیے تھے جبکہ یہ رقم بینک میں مرحوم کے چھوٹے تین بچوں کیلئے ان کے مستقبل کیلئے رکھی ہوئی تھی۔پولیس نے تین ملزمان بھائیوں کو گرفتار کرلیا ہے۔

(محمد رفیق)

خاتون کا مبینہ اغوا

عمرکوٹ تحصیل وضلع عمرکوٹ کے علاقے کپلور کے گوٹھ "مالے جو پار" کے رہواسی خان محمد نوہڑی نے اپنی بیوی زینب کے اغوا کا کیس سمیجا برادری کے (25 افراد) 15 نامزد ہر ایک گل محمد، محمد الیاس، حسین، امید علی، نواب، انور، قادر وغیرہ اور 10 نامعلوم افراد کے خلاف پولیس تھانہ کھوکھراپار پر درج کرایا۔لیکن پولیس کی طرف سے مبینا مغویہ کی بازیابی اور ملوث ملزمان کی عدم گرفتاری کے خلاف کونوہڑی برادری کے درجنوں افراد نے وکیل میر محمد، قائم، وٹو، جام خان، خدابخش، نبی بخش اور عمر اعجاز کی قیادت میں پریس کلب عمرکوٹ کے آگے احتجاجی مظاہرہ کیا۔اس موقعے پر مظاہرین نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ سمیجا برادری کے مذکورہ ملزمان سمیت 25 افراد تین گاڑیوں میں رات کے وقت سوار ہوکر ہمارے گوٹھ پہنچے۔جہاں سرے عام ہتھیاروں کی نمائش کرکے پورے گوٹھ میں دہشت پھیلائی اور فائرنگ بھی کی۔بعد میں اہل خانہ سمیت معصوم بچوں کو یرغمال بنا کر عورت زینب کو اغوا کرکے لے گئے۔مظاہرین نے پولیس کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اگر 24 گھنٹوں میں مغویہ کو بازیاب اور ملزمان کے خلاف کاروائی نہیں کی گئی تو ایس ایس پی عمرکوٹ کے آگے دھرنا دیا جائے گا۔

(نامہ نگار)

اقلیتیں

پاکستان: اقلیتوں کے خلاف جرائم میں سرکاری ملی بھگت کا الزام

---- انسانی حقوق پر اقوام متحدہ کے ماہرین نے پاکستان کی حکومت سے کہا ہے کہ وہ ملک میں ماورائے عدالت ہلاکتوں، ناجائز گرفتاریوں، عبادت گاہوں پر حملوں اور احمدیوں سمیت مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔ماہرین نے کمزور طبقات کے خلاف مذہبی بنیاد پر بڑھتے ہوئے تشدد کی اطلاعات کو خوفناک قرار دیتے ہوئے کہا ہیکہ ان لوگوں کو مہینوں سے متواتر ہراسانی، حملوں اور ہلاکتوں کے واقعات کا سامنا ہے جو ان کے خلاف دشمنی اور نفرت انگیز مہم کے تناظر میں جاری ہیں۔انہوں نے واضح کیا ہے کہ ایسے واقعات کے ذمہ داروں کا محاسبہ یقینی بنانا ہوگا کیونکہ قانونی کارروائی نہ ہونے کے باعث حملوں، نفرت اور تشدد پر اکسانے والے عناصر بلا روک وٹوک ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ان واقعات میں سرکاری حکام کی خاموش ملی بھگت بھی شامل ہوتی ہے جبکہ منفی نتائج کا خوف لوگوں اور اداروں کو اقلیتوں کے حقوق اور وقار کا دفاع کرنے سے روکتا ہے۔

عبادت گاہوں کا انہدام

ماہرین کا کہنا ہے کہ گزشتہ سال احمدی عقیدے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو قتل، دوران حراست ہلاکتوں اور ناجائز گرفتاریوں سمیت حقوق کی پامالی کے بہت سے واقعات کا سامنا رہا۔انہیں مذہبی بنیاد پر تفریق کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ڈسکہ میں ان کی 100 سالہ قدیم مسجد منہدم کر دی گئی، کراچی کے علاقے ملیر میں ایک عبادت گاہ کو بند کر دیا گیا اور بہاولنگر میں واقع مسجد کے مینار توڑ دیے گئے۔کشمیر کے علاقے کوٹلی میں احمدیوں کے قبرستان میں 82 قبروں کو نقصان پہنچایا گیا۔عید کے موقع پر سرگودھا، ڈسکہ، پسرور اور کراچی کے علاقے عزیز آباد میں احمدی عقیدے کے پیروکاروں کی بڑی تعداد کو گرفتار کیا گیا جن میں بچے اور جسمانی معذور افراد بھی شامل تھے۔اس دوران کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں احمدیوں کی مساجد کو بند کر دیا گیا۔

نفرت اور تشدد

ماہرین نے کہا ہے کہ ملک میں توہین مذہب کے الزام میں زیر حراست لوگوں بالخصوص خواتین کو صنفی بنیاد پر نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔حقوق کی یہ پامالیاں پاکستان میں احمدی اقلیت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے خلاف وسیع تر مخالفانہ رویے کی عکاس ہیں جبکہ سیاسی و مذہبی شخصیات کی جانب سے اظہار نفرت اور تشدد کی ترغیب نے ایسے واقعات کی تعداد اور شدت میں اضافہ کر دیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ جون 2024 میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کرتے ہوئے وفاقی اور صوبائی حکومتوں پر تمام شہریوں کی حفاظت اور سلامتی کو یقینی بنانے پر زور دیا تھا لیکن اس کے باوجود اقلیتوں کے خلاف انسانی حقوق کی پامالیوں کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ماہرین نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ پاکستان اپنے ہاں توہین مذہب کے قوانین کو ختم کرے۔

مدد کی پیشکش

ماہرین نے پاکستان کی حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ حقوق کی ان پامالیوں کی فوری تحقیقات کرے، ذمہ داروں کو انصاف کے کٹہرے میں لائے اور بالخصوص احمدی اقلیت کے ارکان کا تحفظ اور سلامتی یقینی بنانے کے لیے بلا تاخیر اقدامات اٹھائے۔اس معاملے میں بعض گرفتاریاں اور عدالتی کارروائی خوش آئند اقدامات ہیں، لیکن مجرموں کو دی جانے والی سزائیں ان کے جرائم کی شدت کے مقابلے میں بہت کم تھیں اور متعدد ملزم سزا سے بچنے میں کامیاب رہے۔ماہرین کا کہنا ہیکہ وہ پاکستان کی حکومت کو شہری و سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدے اور انسانی حقوق سے متعلق دیگر بین الاقوامی معاہدوں کے تحت اس کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

مون سون کے دوران بارشوں اور سیلاب سے جاں بحق افراد کی تعداد 299 ہوگئی، این ڈی ایم اے

...... نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) کے مطابق ملک بھر میں مون سون سیزن کے دوران بارشوں سے جاں بحق ہونے والے افراد کی تعداد 299 ہوگئی۔ سرکاری ٹیلی ویژن کی رپورٹ کے مطابق این ڈی ایم اے نے بتایا ہے کہ مون سیزن کے دوران 26 جون سے اب تک ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد 234 سے بڑھ کر 299 ہوگئی ہے جبکہ 715 افراد زخمی ہوئے ہیں۔ جون سے ستمبر تک جاری رہنے والی مون سون کی بارشیں ایک طرف گرمی سے نجات اور پانی کے ذخائر کو بھرنے کے لیے اہم ہوتی ہیں، تو دوسری طرف یہی بارشیں ہلاکت خیز سیلاب، زمین کھسکنے (لینڈ سلائیڈنگ) اور لوگوں کی بے دخلی کا باعث بھی بنتی ہیں، خاص طور پر ان علاقوں میں جو ناقص نکاسی والے، گنجان آباد یا کمزور انفرا اسٹرکچر کے حامل ہیں۔ این ڈی ایم اے کی جانب سے جاری کردہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق، 'اس سال کی طوفانی بارشوں اور سیلاب میں کم از کم 299 افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، جب کہ مزید 715 افراد زخمی ہوئے ہیں، جاں بحق ہونیوالوں میں 140 بچے، 102 مرد اور 57 خواتین شامل ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ زخمیوں میں 239 بچے، 204 خواتین اور 272 مرد شامل ہیں۔ بارشوں اور سیلاب کے دوران عوامی املاک کو پہنچنے والے نقصان کی تفصیلات میں بتایا گیا کہ کل 1676 مکانات کو نقصان پہنچا، جن میں سے 562 مکمل طور پر تباہ ہوگئے۔ رپورٹ کے مطابق، بارشوں کے دوران 428 مویشی بھی ہلاک ہوگئے۔ 26 جون سے اب تک، این ڈی ایم اے نے متاثرہ علاقوں سے 2880 افراد کو ریسکیو اور محفوظ مقام پر منتقل کیا، جبکہ امدادی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ رپورٹ کے مطابق این ڈی ایم اے نے 13466 امدادی اشیاء تقسیم کیں، جن میں 1999 خیمے، 61 راشن بیگ، 958 کمبل، 569 رضائیاں، 613 گدے، 1282 کچن سیٹ، 1163 فوڈ پیک، 350 لائف جیکٹس، 1122 حفظانِ صحت کے گھریلو کٹس، 2170 ترپالیں اور 146 پانی نکالنے والی مشینیں شامل ہیں۔

پاکستان محکمہ موسمیات (پی ایم ڈی) نے آئندہ ہفتے ملک کے بالائی اور وسطی علاقوں میں مزید بارشوں، ہوا اور گرج چمک کے ساتھ طوفان کی پیش گوئی کی ہے، اور صوبائی و ضلعی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اداروں کو شہری سیلاب کے ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لیے پیشگی اقدامات کی ہدایت کی ہے۔ پی ایم ڈی کی تازہ ترین پیش گوئی کے مطابق، 4 اگست سے 7 اگست تک ملک کے شمالی علاقوں میں بارش، تیز ہوائیں اور گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش متوقع ہے۔ خیبر پختونخوا، پنجاب اور اسلام آباد میں ان تاریخوں کے دوران بارش ہوگی، جب کہ گلگت بلتستان میں بارش 5 اگست سے شروع ہونے کی توقع ہے۔ ادھر بلوچستان میں زیادہ تر علاقوں میں موسم گرم اور مرطوب رہے گا، تاہم 6 اگست کو شمال مشرقی اور جنوبی علاقوں میں بارش، ہوا اور گرج چمک کے ساتھ بارش کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ سندھ کے بیشتر حصوں میں موسم گرم اور مرطوب رہنے کا امکان ہے، جب کہ ساحلی علاقوں میں مطلع ابر آلود رہنے اور ہلکی بارش کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ (بشکریہ ڈان اردو)

موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے میں انسانی حقوق اہم، وولکر ترک

...... اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق وولکر ترک نے عالمی برادری پر زور دیا ہے کہ وہ موسمیاتی تبدیلی سے لوگوں کے حقوق پر بڑھتے ہوئے منفی اثرات کی روک تھام کے لیے بروقت اور موثر اقدامات کرے۔ انہوں نے جنیوا میں اقوام متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے رکن ممالک سے سوال کیا کہ آیا لوگوں کو موسمیاتی تبدیلی سے تحفظ دینے کے لیے حسب ضرورت اقدامات کیے گئے ہیں۔ ہائی کمشنر کا مزید کہنا تھا کہ کیا ایسے اقدامات اور فیصلے لیے جا رہے ہیں جن کی بدولت لوگوں کو موسمیاتی ابتری سے تحفظ مل سکے، ان کے مستقبل کی حفاظت ہو سکے اور قدرتی وسائل کو اس انداز میں استعمال کیا جائے کہ اس سے حقوق اور ماحول کا احترام یقینی بنایا جا سکے۔ انہوں نے اپنے سوالات کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا کہ دنیا اس مقصد کے لیے جو کچھ رہی ہے وہ کافی نہیں۔ موسمیاتی تبدیلی سے جہاں انسانی حقوق کو سنگین خطرات لاحق ہیں وہیں یہ ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ بن رہی ہے۔

مساوی اور پائیدار تبدیلی

وولکر ترک نے کہا کہ دنیا کو اس مسئلے پر قابو پانے کی غرض سے ماحول کے لیے تباہ کن سرگرمیوں کو منصفانہ انداز میں ماحول دوست اقدامات سے تبدیل کرنا ہوگا۔ انسان کو ایسا لائحہ عمل درکار ہے جو یہ بتائے کہ معاشروں، معیشتوں اور سیاست کو مساوی اور پائیدار انداز میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہائی کمشنر نے کہا کہ معدنی ایندھن کے استعمال سمیت ماحول کے لیے نقصان دہ سرگرمیوں کو ترک کر کے ماحول دوست اقدامات کی جانب مراجعت ایسے انداز میں ہونی چاہیے کہ کوئی فرد پیچھے نہ رہے۔ اگر لوگوں کی زندگی، صحت، روزگار اور مستقبل کے مواقع کو تحفظ نہیں دیا جائے گا تو یہ تبدیلی پہلے سے موجود ناانصافی اور عدم مساوات کو مزید بڑھا دے گی۔ (بشکریہ یو این خبرنامہ)

تشدد کر کے آنکھ ضائع کر دی

عمرکوٹ کوتحصیل کنری کے علاقے ٹالہی شہر کے قریبی گوٹھ چوہدری ستار آرائیں کی رہواسی 8 سالا معصوم بچی دامنی بنت سگرام گوار یو برف لینے کے لئے ٹالہی شہر میں برف والے کے دکان پر گئی تو وہاں کام کرنے والے شخص لچھت ولد نارائن بھیل نے برف کاٹنے والا سنبھا مبینا طور پر بچی کو مارا جو کہ بچی کی آنکھ میں جا کر لگا۔ جس کے باعث معصوم بچی کی آنکھ شدید زخمی ہوگئی۔ بچی کو مقامی ہیلتھ سینٹر میں ابتدائی طبی امداد کے بعد سول ہسپتال میر پور خاص منتقل کیا گیا۔ جہاں سے ڈاکٹروں نے حالت نازک ہونے کے باعث بہتر علاج و معالجے کے لئے سول ہسپتال حیدر آباد منتقل کیا۔ والدین کے مطابق جہاں ڈاکٹروں نے بچی کی آنکھ ضائع ہونے کی تصدیق کی۔ اس سلسلے میں متاثر بچی کے بھائی وجیش کمار گوار یانے پولیس تھانہ ٹالہی پر مبینا ملزم کے خلاف کارروائی کے لئے درخواست داخل کروائی ہے۔ مبینا ملزم گرگیز کی دکان پر بطور ملازم کام کرتا ہے اس کا کہنا تھا کہ میں مذاق کر رہا تھا۔ مبینا ملزم کے مذاق نے معصوم کو مستقل معذور بنا دیا۔ (نامہ نگار)

غیرت کے تصور نے جان لے لی

دیر بالا براول تحصیل کے دور افتادہ علاقے شینز گاڑہ درہ گاؤں بیلہ چند میں چترال سے تعلق رکھنے والی خاتون کو غیرت کے نام پر فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔ پولیس ذرائع کے مطابق مقتولہ صاحبہ مشتاق زوجہ حسین اختر دو روز قبل اپنے گھر سے نکلی تھی۔ آج بروز جمعہ دن دس بجے ملزمان نے اُسے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس نے اطلاع ملتے ہی موقع پر پہنچ کر لاش قبضے میں لے لی اور تفتیش شروع کر دی۔ مزید کارروائی جاری ہے۔ (معاذ جان)

☆ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:	

2-وقوعہ کب ہوا؟	سال	مہینہ	تاریخ

3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں	محلّہ
	ڈاک خانہ	تحصیل وضلع

4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں	نہیں

5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)	

6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل

7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد/زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کا رکن	دیگر (تخصیص کریں)	

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ
	-1			
	-2			
	-3			

10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	با اثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ
	-1			
	-2			
	-3			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں

14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے

رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: ....

تاریخ: ....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آسکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆ تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف پُر کر کے بھیجیں

Human Rights Commission of Pakistan

جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جہدِ حق کے تمام قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ یہ رسالہ مفت ہے۔ قارئین کو کسی قسم کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1: تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2: ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3: ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4: کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8: ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موئثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9: کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10: ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11: (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12: کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13: (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14: (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15: (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16: (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17: (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتمائی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20: (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21: (ا) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23: (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25: (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہء قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26: (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27: (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ - 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29: (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشو ونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30: اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
”ایوان جمہور“ 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15

کمپوز:
جمال احمد
سید رضا شاہ